۷۸۶

وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا (القرآن)

۹۲

طلبا کی تقریریں

ملک التحریر

علامہ عبدالحق ظفر چشتی

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور - کراچی ○ پاکستان

نام کتاب	طلباء کی تقریریں
مصنف	علامہ عبدالحق ظفر چشتی
سال اشاعت	دسمبر 2006ء
ناشر	ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور
تعداد	ایک ہزار
کمپیوٹر کوڈ	1Z 33
قیمت	-/115 روپے

ملنے کے پتے

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

داتا دربار روڈ، لاہور۔ 7221953 فیکس:۔ 042-7238010

9۔ الکریم مارکیٹ، اردو بازار، لاہور۔ 7225085-7247350

14۔ انفال سنٹر، اردو بازار، کراچی

فون: 021-2212011-2630411۔ فیکس:۔ 021-2210212

e-mail:- sales@zia-ul-quran.com

zquran@brain.net.pk

Visit our website:- www.zia-ul-quran.com

فہرست مضامین

انتساب

اس عظیم خطیب، خطیب کوہ فاراں، خطیب الانبیاء والمرسلین ﷺ کے نام جن کے خطابات نے تاریخ انسانی کا دھارا بدلا۔

اس صاحب نطق و بیان کے حضور نذر

جس کے نطق کا ایک ایک حرف ولفظ، القاء و وحی الٰہی کے کیف و سرور سے لبریز تھا۔

اس مقرر کے حضور زنبیل فقیر

جس کی تقریر بے معنی و بے مقصد حروف اور زوال پذیر حروف سے پاک و منزہ تھی۔

اس مقرر کے حضور عقیدت کا نذرانہ

جس کے لبوں سے نکلے حروف درختوں، پتھروں اور پتھر دلوں کی دھڑکنوں تک میں اتر جاتے تھے۔

اس مقرر و خطیب کے حضور غلام کا ہدیہ

جس کی زبان سے نکلا ہر حرف نباتات، جمادات، حیوانات، عالم انس و جاں تک سب سمجھ جاتے ہیں اور تسلیم کیے بغیر کسی کو چارہ نہ تھا۔

اس قول کے پکے اور بات کے سچے کے حضور نذر حقیر

جس کی ہر بات سچی، ہر بات سچی اور ناقابل تغیر تھی

اس امید کے ساتھ وہ اپنی رحمتوں سے نوازتے ہوئے۔ امت کے مستقبل کے ننھے مقرروں کے لئے لکھے گئے بے جان حروف و الفاظ میں جان ڈال دیں۔ اور یہ کتاب اثر آفرین ہو جائے اور شرف قبول پائے۔ اور تقریریں پڑھنے والے یاد کرنے والے سننے والے جذبہ عشق و محبت سے سرشار ہوں۔

امیدوار کرم

محمد عبدالحق ظفر چشتی

مصطفےٰ آباد، لاہور

حرف تشکر

یقیناً یہ میرے اساتذہ حضرت علامہ مولانا حافظ محمد علی پسروری اور حضرت علامہ شیخ الحدیث مولانا الہ بخش مدرس جامعہ حضرت میاں صاحب شرقپور شریف رحمۃ اللہ علیہم کا فیضان نظر تھا۔ کہ ایک دیہاتی، پینڈو، گنوار، ڈنگر چرانے والا، نو آموز طالب علم ان کی سرپرستی میں آیا اور ہر جمعرات کی بزم ادب میں۔ پہلی تقریر، بعنوان ''وہ زباں جس کو سب کن کی کنجی کہیں'' کرنے پر محبت بھری نگاہوں کا التفات کا کندھے پر رکھے تہنیت کے جذبات سے لبریز ہاتھ نے مجھے صف خطباء میں شامل فرمایا۔ یہی وہ دست شفقت تھا جس نے بولنے کا سلیقہ بخشا، گفتگو کرنے میں نئی راہیں اپنانے کا حوصلہ دیا اور روایتی تقاریر سے ہٹ کر دور جدید کے تقاضوں کے پیش نظر گفتگو کا راستہ دکھایا۔

مجھے شام 5 بجے کا وہ لمحہ آج تک نہیں بھولا۔ جو 1961ء کے کسی ماہ کا دن تھا۔ لاہور ریلوے اسٹیشن کے پلیٹ فارم نمبر 5 پر اپنے دور کے عظیم ترین مقرر، نکتہ آفریں خطیب، شیخ القرآن ابوالحقائق پیر محمد عبدالغفور ہزاروی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا ہوا ہے۔ اور آپ کسی سوچ میں گم ہیں۔ آپ گویا ہوئے، میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ مولویت چھوڑ دو۔ میں نے عرض کیا۔ حضور میں سمجھا نہیں، اس کا مطلب کیا ہے۔ ڈاڑھی منڈوادوں یا مسجد کی خدمت چھوڑ دوں۔ فرمایا نہیں، بلکہ کفر و شرک کے فتوے لگانا چھوڑ دو کہ یہ مولویت ہے۔ میں نے عرض کیا۔ حضور! آپ کی تقریر تو اس وقت تک بجتی نہیں۔ جب تک یہ انداز اختیار نہ فرمالیں۔ ارشاد فرما ہوئے۔ میں تو کمبل کو چھوڑتا ہوں، کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔

یقیناً اس انداز تربیت نے میری گفتگو کا رخ موڑ دیا اور میں ہر اس موضوع سے دور ہونے لگا جس میں کسی دوسرے گروہ کو ہدف تنقید بنانا مقصود ہو۔ اصلاحی، تعمیری اور روحانی موضوعات سے قرآن کریم بھرا پڑا ہے۔ ہر روز نئے موضوع پر گفتگو کے لئے صفحات قرآن

وحدیث نے مجھے کبھی مایوس نہیں کیا۔ میں نے اس مجموعہ تقریر میں اسی فکر کو سمو دیا ہے۔ آپ کو اس مجموعہ ہائے تقاریر میں اور کچھ ملے یا نہ ملے۔ سرور کونین ہادی انس و جاں ﷺ سے، دین اسلام سے، نظام مصطفوی اور اس کی فکر سے، وطن عزیز پاکستان سے اور ملت اسلامیہ سے محبت کرنے کا جذبہ ابھارنے کا بہت سارا مواد میسر آئے گا۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

ہزار بار سلام۔ اس ماہر کاریگر کو جس نے اپنے فن کو استعمال کیا۔ اور ایک مضبوط، خوبصورت اور اعلیٰ صفات کی حامل کشتی کو وجود بخشا۔ لیکن جب تک کسی کامل ملاح کا ساتھ حاصل نہ ہو۔ کشتی کا دریا میں اترنا، خطرے سے خالی نہیں۔ شکر ہے "سکول و کالجز کے طلباء کی تقریریں" کو منصۂ شہود پر آتے ہوئے کئی سال بیت گئے اور کئی ایک ایڈیشن شائع ہو کر حسن کے طلبگار حسین مقررین کی ہاتھوں کی زینت بنی اب اور اس کی اشاعت کے لئے ایک بہت ہی کامل شخص، باقیات الصالحات کی نشانی اور طباعت کے میدان میں ایک چمکتا دمکتا ستارا، محترم و مکرم جناب صاحبزادہ محمد حفیظ البرکات شاہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور، پاکستان کا ساتھ نصیب ہوا۔ فقیر شکر گزار ہے۔ کہ آپ نے خصوصی توجہ فرماتے ہوئے میری وہ کتب جو طاق نسیاں کے کسی کونے کھدرے میں جا رہی تھیں۔ اپنی سرپرستی میں اعلیٰ طباعت کے ساتھ سامنے لانے کا عزم صمیم فرمایا۔ راقم الحروف آپ کا اور ادارہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز لاہور کا شکر گزار ہے۔

اس نئے ایڈیشن میں کافی غور وخوض کے ساتھ کچھ ترامیم واضافات کیے گئے ہیں۔ جو یقیناً قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث ہوں گے۔ ان شاء اللہ تعالیٰ

محمد عبدالحق ظفر چشتی

مصطفیٰ آباد، لاہور

دیباچہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

انسان اور حیوان کے درمیان وجہ امتیاز قوت گویائی ہے جس کو عربی زبان میں نطق کہتے ہیں اسی نطق کی قوت رکھنے کی وجہ سے ہی حضرت انسان "حیوان ناطق" کہلاتا ہے۔ یعنی تمام حیوانوں میں سے ایسا حیوان جو بول سکتا ہے۔ گفتگو کر سکتا ہے۔ اپنا دکھ، اپنا درد بیان کر سکتا ہے۔ اپنے مافی الضمیر کا اظہار کر سکتا ہے۔ کسی کو بلا سکتا ہے۔ کسی سے پیار و محبت کے اظہار کا یارا رکھتا ہے۔ جبکہ حیوان ان جملہ امور میں حرف یاس کے سوا کچھ نہیں رکھتا۔

حیوان اپنی کیفیات کا اظہار اپنے اعضاء سے کرتا ہے اور مہمل قسم کی آوازیں نکالتا ہے جب وہ اپنا درد اور اپنی تکلیف کسی کو بتا نہیں سکتا تو نہ جانے اس پر کیا گزرتی ہوگی۔ بعینہ ہمارا ایک گونگا بھائی جو زبان تو رکھتا ہے لیکن بول نہیں سکتا اس کے مافی الضمیر کا اندازہ ہم اس کی کیفیت سے ہی لگا سکتے ہیں۔

گویا زبان کے ساتھ ساتھ قوت گویائی اللہ تعالٰی کی ایک بہت بڑی نعمت ہے جو حیوان سے انسان کو ممتاز کرتی ہے۔ جب یہ قوت گویائی اپنی پوری فصاحت و بلاغت کے ساتھ علم و فضل کے ہیرے جواہر اور موتی رولتی ہے تو جادو بکھیرتی چلی جاتی ہے۔ ہزاروں لاکھوں سامعین کے دل قابو کرتی ہے۔ فریفتہ بناتی ہے۔ دنیا پر حکمرانی کرتی ہے۔ مردہ اور بنجر زمینوں کو زندگی بخشتی ہے۔ اندھے دیکھنے لگتے ہیں۔ گونگے بولنے لگتے ہیں بہرے۔ سننے لگتے ہیں۔ اپاہج دوڑنے لگتے ہیں۔

قوت گویائی کی اسی کیفیت کو ہم تقریر اور خطابت کا نام دیتے ہیں۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جس قوم میں مقرر اور خطیب نہیں وہ گونگی ہے۔ اور وہ قوم کبھی غفلت کی نیند نہیں سوتی جس میں مقرر اور خطیب موجود ہوتے ہیں۔ تو پھر ہم کیوں ایسی کاوش نہ کریں کہ قوموں کے گونگے پن کو دور کرنے کی کوشش کریں۔ کیا ہمیں حق حاصل نہیں ہے کہ ہم اپنی

قوم کو ایسے افراد پیدا کر کے دیں جو قوموں کی قسمت سونے ہی نہ دیں۔

یہی جذبہ راقم الحروف کو ہمیشہ مقرر پیدا کرنے پر آمادہ کرتا رہا ہے۔ بچے میرا کل ہیں اور میرے کل کے حسین سہارے ہیں۔ یہی تو میری لاٹھی ہیں۔ یہی میری آنکھیں ہیں۔ یہی میرا مستقبل ہیں۔ میری قسمت کا جاگنا ان سے وابستہ ہے۔ میری زندگی انہی سے وابستہ ہے۔ یہ میرے وطن کے معمار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بچے میری کمزوری ہیں اور بہت بڑی کمزوری ہیں۔ میں بچوں سے پیار کرتا ہوں اور ٹوٹ کر پیار کرتا ہوں۔

ایک بنگالی مفکر ٹیگور کا قول ہے کہ جب بھی کوئی بچہ پیدا ہوتا ہے تو وہ پیغام لاتا ہے کہ فطرت ابھی انسانیت سے مایوس نہیں ہوئی۔ مجھے ہمیشہ کسی ہیرے کی تلاش رہی ہے جب کہیں وہ ہیرا مل جاتا ہے۔ پھر اس کی تراش خراش کرتا ہوں۔ اسے سنوارتا ہوں۔ مجھے کچھ کچھ احساس ہے کہ میں نے قوم کو کچھ ایسے ہیرے دیئے ہیں جو کل کام آئیں گے اور میری قوم کی قسمت سونے نہیں دیں گے۔

فن تقریر پر بازار میں مواد موجود ہے۔ تھوڑا یا بہت، معیاری یا غیر معیاری، جیسا بھی ہے، موجود ہے۔ خواہشمند حضرات فن تقریر کے حصول کے لئے ان کی طرف رجوع کریں۔ میرے مخاطب چونکہ صرف بچے ہیں اس لئے میں صرف اور صرف بچوں کی زبان میں گفتگو کروں گا۔

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے ہاتھوں کے لمس کا اعزاز حاصل کر رہی ہے اور آپ کی آنکھوں کو مصروف مطالعہ کئے ہوئے ہے۔ اس کتاب میں ستر کے قریب میری لکھی ہوئی وہ تقاریر ہیں جو میں بچوں کے لئے گاہے گاہے لکھتا رہا ہوں۔ ان میں سے نوے فیصد ایسی تقریریں ہیں۔ جن پر بچوں نے اول یا دوم انعام حاصل کئے ہیں اور حاضرین سے خراج تحسین لوٹا ہے۔

یہ تقاریر اگرچہ بہت قیمتی سرمایہ تھا لیکن میری عدم توجہی سے ضائع ہوتا رہا۔ دراصل میں اسے بچوں کا کھیل ہی سمجھتا رہا۔ نومبر 1992ء میں، واہ کینٹ میں فیڈرل گورنمنٹ ایجوکیشنل

انسٹی ٹیوشنز کے اداروں کے بچوں کے درمیان کل پاکستان کی سطح پر مقابلوں میں میرا ایک طالب علم مقرر محمد علی شامل ہوا۔ جس نے حاضرین سے زبردست خراج تحسین وصول کیا۔ گویا اس نے مجمع کی نبض پر ہاتھ رکھ لیا تھا اور حاضرین کو تڑپا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی تقریر کے اختتام پر منصفین میں سے اعلیٰ منصف فرط جذبات سے سرشار اٹھے اور بچے کو داد تحسین دیتے ہوئے ، اس تقریر کے لکھنے والے اور بچے کو تیار کرنے والے کی شان میں بھی بہت کچھ ارشاد فرما گئے۔ میں اُن سے اور وُہ مجھ سے آشنا نہ تھے۔ اس وقت میں نے محسوس کیا کہ یہ تقاریر جو بچوں کے لئے لکھتا رہا ہوں۔ یہ بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ یہ ایک بہت بڑا قیمتی سرمایہ تھا۔ لہٰذا میں نے واہ کینٹ سے آتے ہی بکھرے کاغذ اکٹھے کرنے شروع کئے اور ان تقریروں میں سے ستر کے قریب تقاریر جمع ہو سکیں۔ جو پہلی قسط کی صورت میں حاضر خدمت ہیں۔

فن تقریر پر مہارت رکھنے والوں کی نظر میں اس میں بے شمار کمزوریاں اور خامیاں محسوس ہوں گی اور ہیں بھی۔ مجھے اس کا اعتراف ہے۔ اس لئے کہ جب ایک میرے جیسا کم علم انسان یہ کام کرے گا۔ تو پھر ایسا ہی مواد سامنے آئیگا لیکن مجھے فخر ہے کہ میں کل کے بچوں کے لئے ایک بہت قیمتی سرمایہ فراہم کر رہا ہوں۔

خطابت

خطابت اس فن کا نام ہے جس کی مدد سے مقرر اپنی بات دوسروں سے منواتا ہے یا اس سے وہ بیان مراد ہے۔ جو سامعین کے دلوں کو گرماتا ہے کسی امر کا یقین دلاتا ہے یا کسی کام کی ترغیب دے کر یا خاص عمل، روش اور نکتہ نظر پر آمادہ کرتا ہے یا نفرت دلاتا ہے۔

خطابت باطل شکن بھی ہے اور حق نما بھی۔ خطابت شمشیر بھی ہے اور سپر بھی، جو کشش اور جاذبیت خطابت میں پائی جاتی ہے۔ وہ شاید نظم میں نہ ہو۔ خطابت، بے حس قوموں کو جگاتی ہے۔ مردوں کو زندہ کرتی ہے۔ دلوں کو گرماتی ہے۔ دکھ میں تسکین فراہم کرتی ہے۔ مشکل میں استقلال سکھاتی ہے۔ گری ہوئی قوموں کو ابھارتی ہے۔ اور شہرت کا خوبصورت ذریعہ بنتی ہے۔

خطیب اور مقرر کا انداز بیاں اور اس کی اہمیت

دنیا میں آج تک جو کچھ ہوا، ہو رہا ہے، ہوگا، یا ہونا چاہئے وہ سب کچھ بیان کیا جا سکتا ہے لیکن ضرورت ایسے شخص کی ہے جو انہیں بیان کرنا جانتا ہو۔ یہ بات کوئی خاص توجہ کے قابل نہیں ہے۔ کہ مقرر کیا کہہ رہا ہے بلکہ قابل توجہ بات یہ ہے کہ اس کا انداز بیان کیسا ہے۔ جس طرح ہر پھول کا رنگ اس کی مہک اور اس کی نزاکت کا انداز، دوسرے پھول سے جدا ہے اسی طرح ہر مقرر کا انداز بیان بھی جداگانہ ہوتا ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ امتوں کے انقلاب میں شاعر کا قلم، مجاہد کی تلوار، اور مدبر کے دماغ کے ساتھ ساتھ مقرر اور خطیب کی زبان کا اثر بھی خصوصاً شامل رہا ہے۔ اس لئے مقرر کے انداز بیان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ یہی انداز بیان اسے دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔

مقرر اور اس کا لہجہ

لہجہ آواز کی ایک مخصوص فطری کیفیت کا نام ہے، جو ہر شخص کا مختلف ہوتا ہے، لہجہ کے اتار چڑھاؤ کے بغیر الفاظ میں مخصوص معنی پیدا نہیں ہوتے۔ اس لئے لہجے کے انتخاب میں بڑی ہوش مندی کی ضرورت ہے فطری انداز کے ساتھ اسلوب بیان میں تنوع یعنی انوکھے پن کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ زبان اور الفاظ کی تمام آرائش کے باوجود تقریر اگر شروع سے آخر تک ایک ہی لب و لہجہ اور ایک ہی انداز میں ہو۔ تو تقریر سننے والوں کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ تقریر کے بعض حصے مرصع اور بعض حصے سادہ ہونا بہت ضروری ہیں۔ اس سے تاثر بڑھ جاتا ہے۔ بالکل ایسے ہی جیسے مصور اپنی مصوری میں ہلکے اور گہرے رنگوں کو استعمال کرتا ہے۔ کہیں پھول اور کہیں شبنم اسی طرح لہجے میں نرمی سے سامعین میں ہمدردی اور احترام کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ نرم لہجے کا ایک نفسیاتی پہلو یہ بھی ہے۔ کہ سامعین کو مقرر کا مفہوم سمجھنے میں زیادہ توجہ دینا نہیں پڑتی۔

لہجہ اور آواز

نرم و نازک گفتگو دلوں کو تسخیر کرتی ہے۔ جبکہ کرخت آواز کے بارے میں قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے اِنَّ اَنْکَرَ الْاَصْوَاتِ لَصَوْتُ الْحَمِیْرِ ﴿۱۹﴾ (لقمان) کہ سب سے بدترین آواز گدھے کی ہے۔ جو بلند اور کرخت قسم کی ہوتی ہے اسی طرح الفاظ اپنا ایک مزاج رکھتے ہیں مقرر کا لہجہ الفاظ کے معانی اور مطالب کے ساتھ ساتھ بدلتا رہتا ہے۔ الفاظ کو نہ تو مکھی اور ستے کی طرح اگل دینا چاہئے اور نہ چنوں کی طرح چبانا چاہئے بلکہ ان کے ساتھ وہی سلوک کرنا چاہئے جو مصور اپنے رنگوں کے ساتھ کرتا ہے یا ساز بجانے والا اپنی دُھنوں کے ساتھ کرتا ہے۔

جدت اور ندرت

کسی نئے عنوان کو کسی نئے شعر یا ادبی دلکشی، دلچسپ جملے، فقرے سے شروع کرنا چاہیے الفاظ کی ندرت و جدت اور خیالات کی ہم آہنگی سے بات ہمیشہ نئے انداز کے ساتھ شروع کرنا توجہ بڑھا دیتا ہے غرض مقرر کوشش کرے کہ وہ اپنی تقریر میں ایسے انداز کو اختیار کرے جیسا بہتر سے بہتر انداز اس سے ممکن ہو۔ تقریر میں کہیں جوش کہیں دھیما پن کہیں مزاح کہیں سوالیہ انداز کہیں تعجب تقریر کو بے کیف نہیں ہونے دیتا۔ مقرر کو چاہئے کہ اپنے دور کے معروف ترین مقررین کے انداز پر غور کرے ان میں سے جو انداز عوام کے دلوں میں راستے بناتا ہوا ان کے فکر و خیال پر قبضے کرتا چلا جاتا ہو۔ اس کو سامنے رکھے۔ نقل ہرگز نہ اتارے۔ البتہ اس انداز کو کہیں نہ کہیں اپنایا جا سکتا ہو تو اسے اپنا لے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ مختلف شاعر حضرات ایک ہی زمین ایک ہی ردیف و قافیہ اور ایک ہی فکر کو سامنے رکھ کر غزل کہتے چلے جاتے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ہر شاعر کے شعر میں اس کی اپنی فکر اور اس کا اپنا انداز جھلکتا نظر آتا ہے۔ بہترین مقرر وہی ہوتا ہے جو ہمیشہ ایک ڈگر پر نہ چلتا رہے بلکہ اس کی ہر تقریر میں جدت اور ندرت اور انوکھا پن ہو جو اس کی شہرت کو چار چاند لگا دیتا ہے۔

تقریر کی تیاری

تقریر کرنے سے پہلے اس کی بھرپور تیاری کی جائے جس موضوع پر گفتگو کرنا ہے اس سے پوری واقفیت ہونی چاہئے اس موضوع کے بارے میں ہر وہ بات جس سے لوگ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکیں۔ ان کہی نہ رہ جائے کچھ مقررین تقریر کی پوری طرح تیاری نہ کرنے کی سنگین غلطی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ان کی مثال اس مجاہد کی سی ہوتی ہے۔ جو خالی ہاتھ میدان جنگ میں اترتا ہے یا بھیگی بارود اور خالی گولیوں کے ساتھ میدان جنگ میں جاتا ہے۔ کیا وہ اپنے اندر کے خوف اور دہشت پر قابو پا سکے گا۔ ہرگز نہیں۔ اس پر حیران ہونے والی کوئی بات نہیں، مکمل تیاری کے بغیر حاضرین کے سامنے تقریر کرنا ایسا ہی ہے جیسے آدمی نے آدھا لباس پہن رکھا ہو۔

راقم الحروف کی زندگی کے ابتدائی دنوں کی بات ہے کہ میں محکمہ اوقاف کی ایک مسجد میں خطبہ جمعۃ المبارک دیا کرتا تھا۔ ایک روز میرے والد بزرگوار میاں محمد عبدالغنی مرحوم گاؤں سے لاہور تشریف لائے اور خطبہ جمعۃ المبارک میں شمولیت فرمائی۔ ان دنوں میں بھی بغیر تیاری کے ممبر پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ اور چند ادھر ادھر کی باتیں کر کے وقت پاس کرلیا کرتا تھا۔ اس روز بھی ایسا ہی ہوا جمعۃ المبارک کے بعد میرے والد محترم نے مجھ سے دریافت فرمایا کہ آج تم نے کیا تقریر کی ہے میں ان کی بات کو سمجھ گیا اور عذر پیش کرتے ہوئے دلیل یہ دی کہ جمعۃ المبارک کے اجتماع میں لوگ چونکہ بہت کم ہوتے ہیں۔ بلکہ نہ ہونے کے برابر ہوتے ہیں اس لئے میں بھی سستی کر جاتا ہوں۔ تو آپ نے فرمایا: تمہارے ٹرخانے کی وجہ سے ہی لوگ کم ہوتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ جہاں تک تیرے سپیکر کی آواز جاتی ہے۔ وہاں تک تیرا مجمع ہے لوگ گلیوں، کوچوں اور دکانوں میں بیٹھے اور عورتیں بچے، بچیاں گھروں میں تمہاری تقریر سنتے ہیں اور وہ سب تیری اس کمزوری پر آگاہ ہیں اس لئے تقریر سننے نہیں آتے۔

ان کی بات اتنی معقول تھی کہ مجھے احساس ہوا کہ میں نے کس قدر کوتاہی کی ہے۔ اس

کے بعد ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ جب بھی گفتگو کا موقع ملا۔اس سے پہلے موضوع کے بارے میں مطالعہ کیا۔ پھر اس پر گفتگو کی۔اس کا نتیجہ بہت مثبت نکلا۔حاضرین کی تعداد بڑھنے لگی اہل علم کی توجہ ہونے لگی اور میں اہل علاقہ میں عزت وتکریم کی نگاہ سے دیکھا جانے لگا۔

تیاری کا مطلب یہ ہے کہ اس موضع کے بارے میں سوچنا ،غوروفکر کرنا پرانی اور نئی یادداشتوں کو کھودنا ،کریدنا ایسی باتوں کا انتخاب کرنا جن سے آپ خود زیادہ متاثر ہوں ان کی نوک پلک سنوارنا پھر اسے ایک خوبصورت سانچے میں ڈھالنا اور یہ کام کوئی مشکل نہیں۔

تیاری کے لئے ضروری ہدایات

آپ مختلف لفافے یا فائلیں تیار کریں۔کوئی کتاب کوئی رسالہ یا اخبار پڑھتے ہوئے کوئی ایسی بات مل جائے جو تقریر یا موضوع سے متعلق ہو تو اس کا تراشہ یا اس کا نوٹ اپنی فائل یا لفافے میں رکھ لیجئے یا ایک نوٹ بک ،ڈائری اپنے پاس رکھا کریں۔مختلف موضوعات پر حاصل مطالعہ جمع کرلیا کریں پھر انہیں اپنے اپنے موضوع کی فائل یا لفافے میں محفوظ کرتے جائیں اگر اس جمع شدہ مواد پر سالہا سال بھی بیت جائیں تو کیا فرق پڑتا ہے جب کسی موضوع پر تقریر کرنا یا لکھنا مقصود ہو۔وہ لفافہ یا فائل نکالئے اور اس مواد کی مدد سے ایک مضمون یا تقریر تیار کرلیجئے اپنی سابقہ تقریروں کی کانٹ چھانٹ کرتے رہئے وہ کبھی پرانی نہیں ہوتیں۔

وہ خیالات جو آپ کے اپنے ذہن کی پیداوار ہیں وہ سونے چاندی کے زیورات سے زیادہ قیمتی ہیں انہیں محفوظ کرلیجئے۔آپ محسوس کریں گے کہ جن باتوں کا لوگوں کے ذہنوں پر زیادہ اثر پڑتا ہے وہ آپ کے اپنے ذہن کی تخلیق ہوں گی۔

میں نے کئی مذہبی مقررین کو دیکھا ہے کہ انہوں نے چند فقرے رٹے ہوئے ہوتے ہیں۔ بلکہ پوری تقریر میں ایسے ٹوٹکے تیار کئے ہوتے ہیں۔جو ہر تقریر میں کہیں نہ کہیں فٹ کرلیتے ہیں اور یوں اپنی کمپنی کی مشہوری کرتے ہیں۔نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ صاحب علم جب ان کی ایک یا دو تقریریں سن لیتا ہے تو پھر دوبارہ نہیں سنتا ان کے مجمع کے لوگوں کی نفری کم

ہو جاتی ہے جو خود صاحب علم نہ ہوں ان کے لئے وہ ٹو ٹکے ان سے واہ واہ نکلوانے کے لئے کافی ہوتے ہیں۔

مقرر کے لئے مترادفات یعنی ہم معنی الفاظ شعلہ نوائی کا ایندھن ہوتے ہیں کسی پیرے یا فقرے میں برجستہ الفاظ کا حسن استعمال ہی فصاحت و بلاغت ہے یہ بات کبھی نہ بھولئے کہ الفاظ کا بانکپن، فقروں کی آرائش سے ابھرتا ہے اور مقرر کا جوبن اظہار و اسلوب کے زاویوں سے واضح ہوتا ہے۔

مقرر کے لئے ضروری ہے کہ شعراء اور ادباء کے کلام کا مطالعہ کرے۔ کلام کو سنے، پڑھے اور یاد بھی کرے، اس سے بہت کچھ حاصل ہوتا ہے مترادفات ہاتھ آتے ہیں۔ بیان میں سختی پیدا ہوتی ہے اور تلفظ بھی درست ہوتا ہے شاعری کے ذوق و شوق سے مقرر اور خطیب کے بیان میں دل کشی اور دل فریبی پیدا ہوتی ہے۔

مقرر کا فرض ہے کہ الفاظ، محاورے، روزمرہ ضرب الامثال، حکائتیں، تمثیلیں، لطیفے، مرکبات، مترادفات، ضمیریں، تذکیر و تانیث، صرف ونحو، گرائمر اور علم تجوید و قرأت کا مطالعہ رکھے یہ جملہ امور فنی طور پر تقریر کے لئے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں اور خطابت کی نشوونما کے لئے غذا بھی ہیں۔ یہاں ایک واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ ہم بچوں کے ایک تقریری مقابلہ میں شہادت امام عالی مقام کے موضوع پر شمولیت کیلئے بچوں کو لے کر شاہدرہ ٹاؤن لاہور ایک سکول میں گئے۔ دوران تقاریر ایک بچے کا انداز بیاں اتنا خوبصورت اور ایسا نرالا تھا۔ کہ ہر شخص یہی سمجھ رہا تھا کہ اب اس کے بعد کسی مقرر کے پاؤں نہیں جمیں گے۔ بلکہ دوسرے مقابلہ میں شریک بچوں کے دل بجھ گئے اور وہ سمجھنے لگے کہ یہ بچہ ہی اول پوزیشن لے گا۔ لیکن اچانک یہ ہوا کہ تقریر کے اختتام پر اختتامی اشعار پڑھتے ہوئے تلفظ کی ایسی سنگین غلطی ہوئی کہ وہ بچہ کوئی پوزیشن بھی نہ لے سکا۔ بلکہ ہر شخص اس کوتاہی پر اس کو انعام نہ مل سکنے پر کف افسوس ملنے ہوا۔ اس نے مشہور زمانہ حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ کے اشعار پڑھے۔

شاہ است حسین، بادشاہ است حسین　　دین است حسین، دیں پناہ است حسین

سرداد نہ داد دست دردست یزید　　حقا کہ بنائے لا الہ است حسین

اس نے حقا کو حقہ پڑھ دیا اور اپنی ساری محنت پر پانی پھیر دیا۔

کم تعلیم یافتہ مقرر ہر دور کے لئے بڑا خطرہ رہا ہے اس لئے اپنی تقریر سے پہلے مقرر کو چاہئے کہ موضوع تقریر پر غور کرے اس کے پس منظر اور پیش منظر کو دیکھے اس کے متعلق دلائل حقائق اور موزوں اشعار کا انتخاب کرے جس طرح مکان تعمیر کرنے کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے نقشہ بنانے سے پہلے بھی ذہن میں ایک نقشہ ہوتا ہے اس کے مطابق نقشہ بنتا ہے پھر اس نقشے کے مطابق تعمیر کا سامان اکٹھا کیا جاتا ہے بالکل ایسے ہی تقریر کی عظیم تعمیر کے لئے بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

تقریر اور مشق

بے شمار خطیبوں اور مقرروں کی کامیابیوں کامرانیوں اور عظمتوں تک پہنچنے کا راز صرف اور صرف تین حروف کے ایک لفظ میں مضمر ہے اور وہ ہے ''مشق''

اس مشق کے لئے آج تک جو انداز اختیار کئے گئے اور پسندیدگی کی نظر سے دیکھے گئے ان میں سے چند ایک کا ذہن میں رکھنا ضروری ہے۔

1۔ اپنے دل سے چپ چاپ کسی معینہ موضوع پر گفتگو کرنا یعنی کسی خاص موضوع یا عنوان کو منتخب کر کے دل ہی دل میں اس موضوع پر اظہار خیال کرنا۔

2۔ کسی کتاب سے کچھ صفحات کا مطالعہ کر کے اس کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں بیان کرنا۔ اس مشق کی ابتداء اس طرح کی جائے کہ پہلے تھوڑی عبارت کو بغرض مشق اختیار کیا جائے پھر رفتہ رفتہ پوری فصل اور پھر پورے باب کی مشق کی جائے۔

3۔ کسی فصیح شاعر کے کلام کو پڑھ کر اس کو نثر میں ادا کیا جائے۔ اور اس میں اپنے خیالات کے اضافے کے ساتھ اس کو تقریر کی صورت میں پیش کیا جائے۔

4۔ تقریر کی مشق کے لئے حسب ذیل طریقہ کو اختیار کیا جائے۔

1- تمہید   2- دعویٰ   3- دلائل

4- نتیجہ   5- اختتامیہ

تمہید کے بعد دعوے کے ثبوت میں دلائل، دلائل کی روشنی میں نتیجہ اس کے بعد اختتامی انداز اگر تقریر کو ان چار حصوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ذہن کا خاکہ بڑا واضح ہو جاتا ہے۔ اور تقریر کے جملہ پہلوؤں کو بڑے احسن طریقہ سے ذہن میں محفوظ کیا جا سکتا ہے پھر مرحلہ وار اسے بیان کیا جا سکتا ہے اگر تقریر کو ان حصوں میں تقسیم نہ کیا جائے۔ تو وہی تقریر ایک سیلاب بلاخیز کی صورت اختیار کر جائے گی جس سے کوئی خاطرہ خواہ نتیجہ نکالنا ناممکن ہی نہیں محال ہو جاتا ہے۔ ہم نے بے شمار مقررین ایسے بھی دیکھے ہیں جو خود بھی محسوس کرتے ہیں کہ تقریر طویل ہو گئی ہے۔ اس احساس کو مٹانے کیلئے وہ بار بار کہتے ہیں کہ بس آخری بات کہہ کر اجازت چاہوں گا۔ لیکن چونکہ وہ اپنی تقریر کو ان پانچ حصوں میں تقسیم کرنے کی نعمت سے محروم ہوتے ہیں۔ اس لئے بات طویل سے طویل ہوتی جاتی ہے اور ڈور کے الجھے ہوئے سرے کی طرح مزید گنجلک ہوتی جاتی ہے۔ حاضرین بھی اکتا جاتے ہیں۔ اور وہ خود بھی اپنے آخری فقرہ پر کبھی نہیں پہنچتے۔

5- نامور خطیبوں کی تقریریں سننا اور ان کی تقریروں کے دوران اُن باتوں کا خیال رکھنا کہ تمہید کس طرح باندھی گئی ہے اور اس انداز میں کیا ترمیم اور اضافہ کیا جا سکتا ہے تمہید کے بعد اصل مسئلہ کی طرف کیسے رخ کیا گیا ہے برمحل اشعار اور قصص سے موضوع کو کس طرح دلچسپ بنایا گیا ہے۔ مقرر کس انداز سے سامنے آیا ہے اور دوران تقریر اس کا اسٹائل کیا تھا۔ خاص مسئلہ کی طرف توجہ مبذول کرانے کے لئے مقرر کا رویہ کیا تھا۔

ایسے حالات میں جب مقرر حاضرین سے کسی قسم کی اپیل کر رہا ہو۔ یا ان کے دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کر رہا ہو۔ یا خاص مقصد کے لئے ان کے جذبات ابھار رہا ہو اس وقت اس کے چہرے کی کیفیات کیا تھیں۔

یہ باتیں ایک نومشق مقرر کے لئے بہت زیادہ اہمیت رکھتی ہیں۔

تقریر کے لئے مشق کی اہمیت

جس شخص کو اپنے کام سے دلچسپی نہ ہو۔ وہ کسی قسم کی مصروفیت میں کامیاب نہیں ہوسکتا اپنے مقصد سے محبت ہی محنت، جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ ایک نامور مصور سے پوچھا گیا کہ آپ نے کمال کس طرح حاصل کیا تو اس نے کہا صرف ایک اصول اختیار کیا اور وہ یہ کہ جو تصویر میں بنا رہا ہوں اس میں محنت اس طرح کروں کہ یہ میری زندگی کا آخری شاہکار ہو۔

جب شہد کی مکھی شہد کی تلاش میں پھرتی ہے تو اپنے ننھے ننھے پروں کو ایک سکینڈ میں تین سو باون مرتبہ حرکت دیتی ہے اور جب پھولوں سے شہد حاصل کرتی ہے تو اس وقت اس کے پروں کے ہلانے کی اوسط رفتار چار سو چالیس مرتبہ ہے جب ایک معمولی مکھی اپنے مقصد کے حصول کے لئے اتنی جدوجہد کرتی ہے۔ تو ایک انسان جو اشرف المخلوقات ہے اس کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے کتنی محنت اور مشق کرنی چاہیے؟ ہر کھیل، ہر کام اور ہر مرحلہ میں یقینی کامیابی کے لئے کامل توجہ بہت ضروری ہے مسلسل جدوجہد کسی کام سے بس لپٹ اور چمٹ جانا اور بالکل اسی کام کا ہو کر رہ جانا کامیابی کی بنیاد ہے۔ ذرا ڈاک ٹکٹ پر نظر ڈالیں۔ دیکھئے اپنے کام کی انجام دہی کے لئے کس طرح خط سے چمٹ جاتا ہے پھر آپ اسے جہاں چاہیں بھیج دیں۔ لاہور سے مدینہ منورہ، مکہ معظمہ، لندن اور پیرس بھیج دیں۔ کیا مجال کہ ذرہ علیحدہ ہو جائے۔ اور اگر علیحدہ ہو جائے۔ خط اسی وقت بیرنگ ہو جائے گا۔ کاغذ کے اس حقیر ٹکڑے کی مثال اپنے سامنے رکھئے اور جب کبھی آپ کسی اہم کام سے اکتانے لگیں۔ تو ٹکٹ کی طرف دیکھ لیجئے۔ بلکہ ایک ٹکٹ اپنی میز یا کام کرنے کی جگہ پر چسپاں کرلیں۔ تاکہ مقصد کی اہمیت ہمیشہ سامنے رہے۔

ربط و تسلسل

تقریر کی ترتیب پیچیدہ نہ ہو۔ بلکہ واضح اور صاف ہو۔ جس طرح فرلانگ اور میل کے پتھر سڑک پر لگے ہوتے ہیں اور مسافر انہیں دیکھ کر معلوم کر لیتا ہے کہ کتنا سفر طے ہوگیا ہے،

اور کتنا سفر باقی ہے۔اس طرح مقرر کی تقریر کے دوران حاضرین کو علم ہو جانا چاہئے کہ اب تقریر کس نکتہ پر پہنچی ہے اور کب ختم ہونے والی ہے اچھے مقرر کی مثال اس ماہی گیر کی طرح ہوتی ہے جو دریا میں اپنا جال خوب پھیلا کر پھینکتا ہے پھر آہستہ آہستہ اس کو سمیٹتا چلا جاتا ہے۔مقرر بھی اپنے موضوع کو پہلے پھیلاتا ہے پھر اس کو مختصر سے مختصر کرتا چلا جاتا ہے اور تقریر کو ایک مرکز پر جمع کر لیتا ہے۔

کتب بینی اور شوق مطالعہ

علم و فضل کے ہیرے جواہر اور موتی جن خزانوں میں سر بمہر ہوتے ہیں۔دنیا اسے کتاب کے نام سے یاد کرتی ہے۔لہٰذا جس شخص کو تقریر کرنے کا شوق ہو اسے علماء و فضلا اور ادیبوں اور شاعروں کی کتابوں کا خوب مطالعہ کرنا چاہئے جب آپ کے ذہن میں جامع خیالات جمع ہو جائیں تو شروع سے آخر تک ان پر غور کریں۔خیالات کا ہجوم ہوگا۔تو لفظ خود بخود چلے آئیں گے۔جس طرح آپ کیتلی میں پانی ابلتا دیکھتے ہیں۔اس طرح حاصل مطالعہ مجموعہ خیالات آپ کے ذہن کی کیتلی میں ابال کھائے گا اور باہر نکلنے کا راستہ یعنی موزوں الفاظ خود ہی تلاش کر لے گا۔

گزشتہ دور کے ایک نامور مقرر شورش کاشمیری وائی ایم سی ہال لاہور میں تقریر کر رہے تھے اور تقریر کے دوران انہوں نے کہا حسین الفاظ کا ایک جم غفیر مرے حضور ہاتھ باندھے کھڑا ہے۔اور میری منتیں کرتا ہے کہ مجھے استعمال کرو مجھے استعمال کرو پھر میں ان میں سے اپنی پسند کے الفاظ چنتا ہوں آپ کے سامنے پیش کر دیتا ہوں۔الفاظ، خیالات، تصورات، تلمیحات، محاورات، چیدہ چیدہ اشعار کا انتخاب، جدید قدیم شعراء کے کلام کا حاصل مطالعہ، معروف مقررین و شعلہ نوا خطباء کا انداز بیان، یہ تمام عناصر جب باہم ملتے ہیں۔تو جذبات کا ایک ریلا اور سیلاب آتا ہے جو حاضرین و سامعین کے دلوں کی دنیا جگا دیتا ہے۔

وقت کی کمی کا رونا

کچھ لوگ وقت کی کمی کا ہمیشہ شکوہ کرتے رہتے ہیں۔حالانکہ ہمارے پاس ایسا وقت

ضرور ہوتا ہے جس میں ہم سوچتے ہیں کہ اس وقت ہم کیا کریں۔ یہ خواہ مخواہ ایک بہانہ ہے کہ وقت بہت کم ہوتا ہے۔ اگر غور کیا جائے تو احتیاط و باقاعدگی کے ساتھ ہم کتنا وقت مطالعہ میں صرف کرتے ہیں۔ اور کتنا وقت بے مقصد ملاقاتوں میں ضائع کر دیتے ہیں۔ ہمارے پاس چوبیس گھنٹوں میں چند گھنٹے ایسے ضرور ہوتے ہیں یا ہونے چاہئیں جن میں ہم جو چاہیں، کر سکیں۔ اگر ایسے وقت میں ہم مطالعہ کریں۔ یا تقریر کی مشق کریں تو یہ انداز کامیابی کی راہ ثابت ہوگا۔

تبادلہ خیال

جس علم کو دہرایا نہ جائے وہ مردہ ہو جاتا ہے۔ بے جان مادہ اس وقت تک بے جان ہی رہے گا جب تک اس مادے سے نہ مل جائے جو جاندار ہے۔ علماء و اساتذہ، شعراء و ادباء اور افضل لوگوں سے مختلف موضوعات پر تبادلہ خیال ذہن کو جلا بخشتا ہے۔

ایک جلسہ میں بہت سے علماء جمع تھے ان میں کچھ غیر معروف علماء تھے اور کچھ کافی حد تک معروف و مشہور۔ جب ایک غیر معروف عالم دین کی تقریر شروع ہوئی تو ایک معروف عالم دین نے دوسرے سے کہا آؤ اس کی تقریر سنیں تو انہوں نے ناک منہ چڑھاتے ہوئے معذرت کر لی تو کہنے والے عالم دین نے کہا میرے دوست! بعض اوقات غیر معروف شخصیتوں سے بھی ایسی باتیں مل جاتی ہیں۔ جو اعلیٰ شخصیتوں سے بھی نہیں ملتیں مجھے ان کی یہ بات بہت بھلی معلوم ہوئی اور واقعی جب ہم نے ان کی تقریر سنی تو وہ ایک انوکھا باب تھا انوکھا انداز تھا لوگوں کے دلوں میں گھر کر رہا تھا۔

اس لئے مطالعہ کے بعد تبادلہ خیال ضروری ہے بعض اوقات انسان اپنے مطالعہ میں ایک مسئلہ کو ایک انداز سے سمجھتا ہے۔ لیکن جب دوسرے ارباب اس پر گفتگو کرتے ہیں۔ تو اس کی کئی اور راہیں کھل جاتی ہیں۔

البتہ جس طرح بے مقصد مطالعہ نہ صرف فضول ہے بلکہ مضر ہوتا ہے اسی طرح بے مقصد مباحثہ بھی نہ صرف فضول ہوتا ہے بلکہ وقت اور صلاحیتوں کا ضیاع ہے بے کار بحث

مباحثہ سے بعض اوقات تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔

دائرہ علم و تحصیل علم

علم کے حصول کے لئے صرف ایک دو شعبے مخصوص نہیں کر لینے چاہئیں بلکہ مقرر کے لئے لازمی شرط ہے کہ وہ ہر شعبہ زندگی کے علم سے آگاہی حاصل کرے اور ہر مکتب فکر کی کتب کا مطالعہ کرے، مطالعہ کی حد تک اپنے ذہن کو وسعت دے۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں کہ فریق مخالف یا۔ بے دین لوگوں کی کتابوں کا مطالعہ اس قدر زیادہ ہو جائے کہ اپنے دین سے ہی متنفر ہو جائے الامان والحفیظ!!

تقریر کی طوالت اور اختصار

بعض مقررین گفتگو اتنی طویل کر دیتے ہیں کہ سامعین کے چہروں سے ناگواری کے اثرات صاف ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ جو شخص تمہاری بات غور سے نہ سنے اسے سننے کی تکلیف ہی نہ دو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ کہ جب تک لوگ تمہارے چہرے کو دیکھتے ہیں اس وقت تک تقریر کرتے رہو۔ جب ان کی توجہ میں ذرہ برابر فرق آ جائے تو فوراً رک جاؤ۔

تقریر کو مخصوص وقت میں سمیٹ نہ سکنا مقرر کی بہت بڑی خامی ہوتی ہے اور یہ خامی ان مقررین میں ہوتی ہے۔ جو اپنی تقریر کو تمہید ''ابتدائیہ'' دلائل اور نتائج کے ترازو پر تولنے کی مشق نہیں کرتے یا اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ تقریر کے دوران سامعین کی اکتاہٹ مقرر کی سب سے بڑی ناکامی ہے۔

تقریر نہ تو اتنی مختصر ہو کہ بات واضح نہ ہو سکے اور نہ اتنی طویل ہو کہ اس کا سرا ہی نہ ملے ان ہر دو کے درمیان وہی راستہ ہے جو ہر میدان میں اختیار کرنے کے لئے ہمارے آقا حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے دین نے دیا ہے کہ خَیْرُ الْاُمُوْرِ اَوْسَطُهَا ہے کہ بہترین راستہ درمیانہ ہے۔

تمہید

تقریر کی ابتداء سے پہلے بھی چند امور کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے مجمع کے شایان شان الفاظ کا استعمال، مخاطب ہونے میں سامعین اور اپنی عمر کا فرق اپنے اور سامعین کے علم اور رشتے کا فرق۔

جس طرح عنوان، مضمون کی طرف اشارہ کرتا ہے اسی طرح تقریر کی تمہید سے تقریر کا حال معلوم ہو جانا چاہئے عام طور پر تمہید کو مثالوں، مقولوں، محاوروں اور اشعار سے شروع کیا جاتا ہے تقریر کی ابتداء میں سامعین مکمل طور پر متوجہ ہوتے ہیں۔ بعد میں مقرر اپنی کمزوری کی وجہ سے عدم توجہ کا شکار ہوتا ہے تمہید کی طوالت یا اختیار موقع و محل اور نزاکتِ وقت پر منحصر ہے۔

اختتام

اگر تقریر کا اختتام موثر نہ ہو تو اچھی سے اچھی تقریر اپنے اثر کے لحاظ سے اکثر ناکام ہو جاتی ہے۔ اختتام کے مناسب وقت کا ٹل جانا گویا اثر کا زائل ہونا ہے کئی بار ایسا ہوا۔ کہ اچھی سے اچھی تقریر ایک مناسب اختتام نہ ہونے کے باعث بے اثر ہو گئی۔

الفاظ کی اہمیت اور ان کا استعمال

خوبصورت اور مکمل الفاظ یاد کرنا اور یاد رکھنا بہت ہی قابل قدر اور بہترین عقل مندی ہے۔ اگر چہ الفاظ مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں لیکن یہ حقیقت ہے کہ زمین و آسمان کی جملہ اشیاء کو اپنے قبضہ و قابو میں رکھ سکتے ہیں۔ خواہ وہ اشیاء کتنی ہی مضبوط اور طاقتور کیوں نہ ہوں۔ یہ معمولی الفاظ ہی تو ہیں جن کی مدد سے آج دنیا ترقی کی معراج پر پہنچی ہوئی نظر آتی ہے۔ البتہ الفاظ ترتیب کی خوبی کے بغیر بالکل بے کار ہیں علامہ ابن خلدون نے الفاظ کو پیالہ اور معانی کو پانی سے تشبیہ دی ہے۔ پانی کو سونے کے پیالے میں بھر لو۔ تو اس کی قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے جبکہ وہی پانی مٹی کے پیالے میں ہو تو اس کی وہ

حیثیت نہیں رہتی لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ برتن کے بدل جانے سے پانی کی ماہیت بدل جائے گی مثلاً سونے کے پیالے میں زہر ڈال دینے سے وہ امرت نہیں بن جاتا۔اور نہ امرت مٹی کے پیالے میں ڈالنے سے زہر بن جائے گا۔ہاں ظرف کی ظاہری خوبی کی وجہ سے مظروف کی حیثیت پر ضرور اثر پڑتا ہے۔یہی وہ خوشنمائی اور دل آویزی ہے جس پر کسی بھی تقریر کا دارومدار ہوتا ہے۔

لفظ دراصل ایک قسم کی آواز ہے جبکہ بعض آوازیں میٹھی، سریلی دل آویز اور لطیف ہوتی ہیں۔ جیسے بلبل، کوئل، طوطی اور مینا کی آوازیں، اور بعض آوازیں مکروہ، بھدی اور ناگوار ہوتی ہیں۔ جیسے کوے اور گدھے کی آواز اسی طرح الفاظ بھی دوطرح کے ہوتے ہیں۔بعض شستہ، سبک، شیریں اور بعض ثقیل، بھدے اور ناگوار ہوتے ہیں۔پہلی قسم کے الفاظ فصیح کہلاتے ہیں اور دوسری قسم غیر فصیح۔

حاصل مطالعہ

جس طرح عمارت کی تعمیر میں صرف گچ اور چونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی بلکہ اور بہت سی ضروری چیزیں بھی درکار ہوتی ہیں۔اسی طرح اثر پذیری میں انداز بیان اور مواد ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ ذرا غور کریں کہ ہم ایک خوبصورت اور دلربا شکل دیکھ کر متاثر ہوتے ہیں۔اگر کوئی پوچھے کہ وہ کونسی خاص چیز ہے جس کو دیکھ کر متاثر ہوئے ہو۔تو شاید ہم اس کو بیان نہ کرسکیں اسی طرح اثر پذیری کا مدار بھی کسی ایک یا دو چیزوں پر نہیں ہوتا۔ بلکہ ایکشن کی اہمیت، الفاظ کا بجا استعمال، مناسب الفاظ کے ساتھ تمہید واختتام، قوت ارادی، نفسیات دانی، مقرر کا لباس، مقرر کا تناسب اعضا، دانتوں کی صفائی، تقریر کی طوالت اور اس کا اختصار یہ سارے عوامل مل کر اثر پذیری کا جامہ پہنتے ہیں۔اسی لئے دوران مطالعہ نئے الفاظ یاد کئے جائیں۔الفاظ ومحاورات، تشبیہات اشارات وکنایہ جات جمع کر کے اپنی ایک بیاض میں محفوظ کر لئے جائیں۔ اچھے اشعار اچھے مقولے، فقرے، خیال، تصور، تلمیحات اور استعارے تلاش کر کے محفوظ کئے جائیں۔اور فارغ وقت میں ان کو یاد کیا جائے۔دوران

مطالعہ اگر کسی کتاب رسالہ یا اخبار میں سے قابل ذکر بیان نظر آئے تو اسے پنسل سے نشان زد کریں۔ کتاب ختم ہونے پر ان باتوں کو اپنی بیاض میں نوٹ کر لیں اور گاہے گاہے ان پر نظر رہے وہ خود بخود ذہن میں محفوظ ہو جائیں گے۔

مقرر کی سیرت اور کردار

اخلاق نے جو اصول مرتب کئے ہیں ان کی پابندی کا نام کردار ہے اور کردار کی بنیاد علم و حقائق پر ہے کردار ہی انسان کی کسوٹی ہے جو قومیں صاحب کردار نہیں ہوتیں۔ ان سے دنیا کی امامت چھین لی جاتی ہے۔

جن لوگوں کے ضمیر مردہ ہوں۔ وہ کبھی اچھے مقرر نہیں بن سکتے بے خوفی جرأت و بے باکی صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جن کے دامن جرم و گناہ کے دھبوں سے پاک ہوں احساس گناہ آدمی کی ہمت اور حوصلے کو پابہ زنجیر رکھتا ہے ایک بدکردار مقرر عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتا۔ جس کھیت میں خاردار جھاڑیاں یا گھاس پھونس اُگتی ہو۔ اس مقام پر غلہ کی پیدائش کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مقرر کے لئے نیک چلنی اور اعلیٰ کردار بالکل ایسے ہی ہیں جیسے آئینے کے لئے پارہ۔ نیکی بذات خود ایک جوہر ہے اور یہ جوہر ہر مقرر کے لئے اتنا ہی ضروری ہے جتنا انسان کے لئے لباس۔ اور کردار بنانے کے لئے ایثار، اولوالعزمی، ہمت اور قربانیوں کی ضرورت ہوتی ہے۔

بدکردار انسان کی گفتگو محض الفاظ کا گورکھ دھندا ہوتا ہے وہ زبان کو صرف ایک آلہ بناتے ہیں۔ جس سے الفاظ نکلتے ہیں۔ جبکہ زبان سے نکلی ہوئی بات کانوں سے آگے نہیں بڑھتی۔ جبکہ دل سے نکلی ہوئی بات دلوں تک اثر کرتی ہے۔

کامیاب مقررین

تاریخ انسانی نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے اس وقت سے انسانیت کسی نہ کسی مقصد کی مرہون منت ہے ہر دور ہر ملک اور ہر قوم کا کوئی نہ کوئی ایسا مقرر ضرور رہا ہے جس نے قوموں کی سوئی ہوئی قسمتوں کو جگایا۔ ہماری تاریخ میں باوقار، باکردار اور ذہنوں،

جذبوں اور پتھروں میں جان پیدا کرنے والے مقررین کی ایک طویل فہرست موجود ہے
حضور رحمت عالم ﷺ کی پر تاثیر گفتگو دلوں کی گہرائیوں تک اتر جاتی تھی یہی وجہ ہے کہ
بڑے سے بڑا دشمن بھی آپ کی گفتگو، آپ کی صداقت، آپ کی امانت اور آپ کے
ارشادات کو ہدف تنقید نہیں بنا سکتا۔ حضرت جعفر طیار رضی اللہ عنہ نے نجاشی بادشاہ کے دربار
میں جس خوبصورت انداز سے گفتگو کی اس کے اثرات سے کون واقف نہیں۔ حضرت علی،
حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما ہمارے اولین اور اعلیٰ ترین مقررین میں شامل ہیں۔ دور
حاضر بھی اچھے مقررین سے محروم نہیں رہا۔ حضرت شیخ القرآن مولانا محمد عبدالغفور ہزاروی،
مناظر اسلام مولانا محمد عمر اچھروی، ابوالکلام پیر سید فیض الحسن شاہ، مولانا محمد شریف نوری
قصوری، مولانا محمد یار گڑھی اختیار خاں شریف، سید احمد سعید کاظمی، پیر کبیر علی شاہ چوراہی،
سید عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ظفر علی خاں، حافظ کفایت حسین، علامہ رشید ترابی، علامہ نصیر
اجتہادی، جناب ڈاکٹر پروفیسر محمد طاہر القادری وغیرہ۔

میں امید کرتا ہوں۔ اگر مقررین طلباء نے ان امور کو پیش نظر رکھا۔ تو یقیناً ایک بہترین
مقرر کی حیثیت سے ابھریں گے۔

محمد عبدالحق ظفر چشتی

سیرت النبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

زہے تاثیر ان کا نام نامی جب لیا جائے
زباں کو لازماً صل علی کہنا ہی پڑتا ہے

صدر گرامی قدر اور حضرات محترم!

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی سیرت پر تقریر کرنے کے لئے کھڑا ہوا ہوں تو یوں محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے کسی چمن پر بہار کے دروازے پر آ کھڑا ہوں جس کا ہر پھول خوش رنگ اور ہر بوٹا خوش نما ہے۔ ہر ایک کی مخصوص مہک ہے کہ دل کو بے خود کئے دیتی ہے ایک نظارے سے جی نہیں بھرتا کہ دوسرا منظر دعوت کیف و مستی دینے لگتا ہے ایسے میں حیران ہوں کہ آپ کے سامنے کونسے منظر کی دلکشی کا تذکرہ کروں اور گلشن صد بہار کے کونسے گوشے کی سیر کراؤں۔

مجھ سے تو ہو نہ سکے پیکر دلبر کا بیاں
یہ الگ بات ہے دیتا رہوں اظہار کو طول

وہ ہستی عظیم جسے خود خالق ارض وسما نے اِنَّكَ لَعَلٰی خُلُقٍ عَظِیْمٍ (قلم) کا مژدہ جانفزا سنایا ہو۔ وہ ذات اعلیٰ جسے وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِیْنَ (الانبیاء) کے خطاب بلند سے نوازا ہو۔ وہ ذات کریم جن کی تعریف میں دشمن بھی رطب اللسان ہوں ان کے اخلاق و کردار کے تذکرے کا حق کون ادا کرسکتا ہے۔

لا یمکن الثناء کما کان حقہ
بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حضرات محترم!

دنیا جہالت کے سمندر میں غرق تھی اور بداعمالیوں سے ظلمت کدہ بنی ہوئی تھی۔ راتوں پر کفر کی سیاہ تاریکیوں کے پہرے تھے۔ نیکی نفس امارہ کی بے رحم زنجیروں میں جکڑی ہوئی

تھر تھر کانپ رہی تھی۔ معمولی معمولی باتوں پر تلواروں کو خون کا نذرانہ پیش کیا جاتا تھا۔ نیکی کفر و شرک کی گھٹا ٹوپ اندھیروں میں سسکیاں لے رہی تھی۔ انسانیت لاقانونیت کے شکنجے میں جکڑی شدت کرب سے کراہ رہی تھی۔ یہاں تک کہ اس کی آہیں آسمان کو چیرتی ہوئیں عرش الٰہی تک جا پہنچیں۔ رحمت حق جوش میں آئی اور فاران کی چوٹیوں سے آفتاب ہدایت نمودار ہوا اور پھر اس آفتاب رشد و ہدایت کی کرنیں خاک پر پڑیں تو وہ کندن بن گئیں۔ پتھر پر پڑیں تو وہ لعل بدخشاں بن گیا، ذرہ، عکس جمال محبوب سے ماہتاب بن گیا آپ نے قطرے کو دریا، ذرے کو صحرا اور غلاموں کو مولا بنا دیا اور امیری و غریبی، جوانی و پیری، امن و جنگ، گدائی و بادشاہی، مستی و پارسائی، رنج و راحت اور حزن و مسرت کے ہر مقام پر انسان کی رہبری کی۔ آپ ﷺ نے فلک کی بلندی پر، زمین کی پستی، رات کی تاریکی، دن کی روشنی سورج کی چمک، جگنو کی دمک، غنچے کی چٹک، پھولوں کی مہک، بلبل کی لہک، اور ذرے کی پرواز میں عرفان ربانی کی سیر کرائی۔

آفتاب رسالت ﷺ کی کرن ابوبکر پر پڑی تو اسے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ بنا گئی۔ ضیاء مصطفےٰ ﷺ ابن عفان پر پڑی تو وہ عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ بن گئے ابن خطاب پر پڑی تو فاروق اعظم رضی اللہ عنہ بن گئے علی ابن ابی طالب پر پڑی تو حیدر کرار رضی اللہ عنہ، خیبر شکن بن گئے۔ جاہل آپ کی صحبت میں آیا تو عالم بن گیا راہزن راہبر بن گئے چرواہے نے قدم بوسی کی تو حکمران بنا دیا گیا۔

غرض آپ ﷺ کی ہستی ایک پارس کا نمونہ تھی جو اس کے قریب ہوا وہ زر خالص بن گیا۔

وہ دانائے سبل ختم الرسل مولائے کل جس نے
غبار راہ کو بخشا فروغ وادی سینا
نگاہ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر
وہی قرآں وہی فرقاں وہی یسین وہی طٰہ

برادرانِ ذی شان!

آج انسانیت پھر داغ داغ ہے۔ امن وسکون خاکستر ہو چکا ہے۔ آج پھر جہالت للکار رہی ہے۔ باطل پھنکار رہا ہے۔ تاریکیوں کے مہیب سائے بڑھتے چلے جا رہے ہیں۔ زہرہ مریخ پر کمندیں ڈالنے والا انسان آج بے بس نظر آ رہا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تار کی سحر کر نہ سکا

اور یہ سحر نظام مصطفیٰ ﷺ سے ہی طلوع ہو سکتی ہے۔ انسانیت کی پیاس اس چشمہ فیض سے ہی بجھ سکتی ہے۔ آیئے اپنے کردار و عمل کو سیرت خواجہ کونین ﷺ کی قندیل سے روشن کر لیں۔ پھر اس روشنی کو چار دانگ عالم میں پھیلانے کا عزم صمیم کر لیں اور پھر! انشاءاللہ۔

شب گریزاں ہو گی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہو گا نغمۂ توحید سے

حسن سیرت مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم

تری صورت، تری سیرت، ترا نقشہ، ترا جلوہ
تبسم گفتگو، بندہ نوازی، خندہ پیشانی

حضرات محترم!

جب دنیا پر تاریکی نے اپنا بھرپور تسلط جمالیا، جب ظلم و جور کے طوفانوں نے خدا کی مخلوق کو پوری طرح اپنی لپیٹ میں لے لیا، جب جہالت کے عفریت کے ناپاک پنجے انسانیت کو اپنی گرفت میں لے چکے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی مخلوق چیخ رہی تھی۔ شیطانیت زیرلب تبسم ریز تھی۔ ہر طرف بدامنی و بدعملی کا دور دورہ تھا۔ تو اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق پر رحم آیا، ظلم کی چکی سے نجات دلانے۔ امن و آشتی کا پیغام جانفزا سنانے۔ جہالت اور طاغوتی طاقتوں سے بچانے۔ علم و فضل اور رحمانی صراط مستقیم سے آگاہ کرنے۔ باعث تخلیق کونین، عرش کے دولہا، محسن انسانیت، رحیم و کریم آقا حضرت محمد مصطفیٰ احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کو مبعوث فرمایا۔ آپ سیرت و صورت، علم و عمل، ہر اعتبار سے اکمل و مکمل بنا کر بھیجے گئے۔ آپ کے آنے سے تاریکیاں چھٹ گئیں۔ جہالت نے منہ کی کھائی۔ ظلم و ستم کے دانت کھٹے ہوئے۔ سفاکی و بربریت نے منہ پھیرا۔ دکھیوں کو آرام ملا۔ غلاموں کو آزادی ملی۔ عورتوں کو مقام عزت، بے سہاروں کو سہارا ملا۔ گڈریے، آقا بنے۔ سفاکوں اور ظالموں کو امن و آشتی کی علامت بنا دیا۔

ڈوبا تو نکالا ہے پھسلا تو سنبھالا ہے
میں بھول نہیں سکتا احسان محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا

آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے اپنے خالق کی عطا کردہ تمام قابل فخر صلاحیتوں سے دنیا کی کایا پلٹ کر رکھ دی۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے زندگی کے ہر شعبے میں نور کی ایسی شمع روشن کی کہ اس کی روشنی

آج تک ماند نہیں پڑی اور تا قیام قیامت ماند نہیں پڑے گی۔ کیونکہ

نور خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن

پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

حضرات محترم!

حضور اکرم ﷺ نے بحیثیت رہبر، رہبری کا حق ادا کر دیا۔ بحیثیت عابد، اتنی عبادت کی کہ خود خالق کائنات اور معبود حقیقی نے فرمایا: اے محبوب

قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۝ (مزمل)

''راتوں کو اتنا قیام نہ فرمایئے کہ پاؤں پر ورم آنے لگے''۔

بحیثیت منصف تاریخ عالم میں ایسے باب رقم کئے کہ کہ مورخ مثال دینے سے قاصر ہے۔ حسین وجمیل ایسے کہ ان کی پیشانی سے بھیک لے کر چاند روشن ہو۔ کریم وشفیق ایسے کہ اپنے خون کے پیاسوں تک کو لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ (یوسف: 92) کا مژدہ جانفزا سنایا۔

ان کا بچپن ایسا کہ رشک آئے۔ جوانی ایسی کہ کوئی حرف نہ آئے۔ بڑھاپا ایسا کہ اس کے حسن میں ہر کسی کا ڈوبنے کو جی چاہے۔

حسینوں میں حسیں ایسے کہ محبوب ﷺ خدا ٹھہرے

نبیوں میں نبی ایسے کہ ختم الانبیاء ﷺ ٹھہرے

☆☆☆☆☆☆

صورت کے ساتھ جن کی سیرت بھی تڑپا دے

ایسے حسین خال خال ہوتے ہیں

حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بحیثیت سپہ سالار

سلام ان پر کرم تھا عام جن کا دوست دشمن پر
سلام ان پر جو سوتوں کو جگانے کیلئے آئے
کھلائے پھول صحرا میں چمن کو رونقیں بخشیں
فضاء پر ابر رحمت بن کے چھانے کیلئے آئے

حضرات گرامی اور صدر ذی شان!

حضور سرور کون ومکاں صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات عظیم ہمہ صفت موصوف ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو پوری کائنات کے لئے ایک بے مثال نمونہ بنا کر بھیجا ہے۔ زندگی کا کوئی شعبہ تشنہ کام نہیں چھوڑا۔ آپ نے ہر شعبہ ہائے زندگی میں رہبری کا حق ادا کر دیا۔ باپ بیٹا، بھائی، خاوند اور گھر کے سرپرست سے لے کر جہاں بھر کی حکمرانی تک ہر میدان میں ایسے ایسے باب رقم کئے کہ آج تک حرف آخر ہیں اور قیامت تک حرف آخر ہی رہیں گے۔

سلام اس پر کہ جس کے ذکر سے سیری نہیں ہوتی
سلام اس پر کہ جس کی بزم میں قسمت نہیں سوتی

جنگ کا میدان ایسا میدان ہے۔ جسے سازشوں کے جال، قتل وغارت، چیخ وپکار کے میدان سے تشبیہہ دی جائے تو بے جا نہ ہوگا بلکہ کبھی کبھی انسان اس میدان میں قدم رکھ کر انسان ہی نہیں رہتا درندہ بن جاتا ہے۔ اور انسانیت کے لئے باعث ننگ بن جاتا ہے۔ بلکہ کبھی تو ذلت کے ایسے غار میں جا گرتا ہے کہ پوری قوم شرم کے مارے پانی پانی ہو جاتی ہے۔ آج کی اس نشست میں ہم اس میدان میں قدم رکھنے والے کسی ایسے سپاہی کی بات نہیں کر رہے اور نہ کسی ایک قوم یا فوج کے سپہ سالار کی بات ہو رہی ہے بلکہ آج ہم اس

یکتائے روزگار، یگانۂ زمانہ کی بات کر رہے ہیں۔ جو پوری کائنات انسانیت کا سپہ سالار ہے جس کے سامنے قیامت تک کے لئے رہبری کا وسیع میدان ہے۔

بار الٰہ میری زباں پہ یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

صدر والاشان

حضور سرور دو جہاں ﷺ نے میدان جنگ میں تو اس وقت قدم رکھ دیا تھا۔ جب آپ ﷺ نے توحید کا اعلان فرمایا تھا البتہ آپ مکہ کی جنگ کو سرد جنگ سے تشبیہ دے سکتے ہیں۔صبر واستقلال کی جنگ کہہ سکتے ہیں۔ دشمن آپ ﷺ کو آپ کے نام لیواؤں کو دبانے بلکہ صفحہ ہستی سے مٹانے کے لئے ہر قسم کی سازش اور بربریت آزماتا ہے۔ ظلم وستم کے تمام تیر آزماتا ہے۔ لیکن آپ ہیں کہ عزم کی تلوار ہیں کوہ گراں ہیں اگر چاہتے تو دس بیس ساتھیوں کے ساتھ ہی مقابلہ کر کے کوئی چار پانچ کو واصل جہنم کر ہی لیتے کون کسی کو منہ میں ڈال لیتا ہے وہ لوگ جنگ آشنا تھے۔ لڑنا جانتے تھے۔ مرنا جانتے تھے۔ جانبین میں ایک ایک بیسیوں پر بھاری تھا لیکن نہیں ایسا نہیں ہوا اپنے سامنے جاں نثاروں کو بازاروں میں گھسٹتے دیکھا، دہکتے ہوئے انگاروں پر لوٹتے دیکھا، مسلسل تین سال شعب ابی طالب میں بھوک و پیاس کے عفریت کے ساتھ صبر و استقلال کے ہتھیاروں کے ساتھ جنگ کی اور صبر کو نئی راہوں سے آشنا کیا۔ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سر مبارک پر پھینکے گئے راہ میں کنویں کھودے گئے، قتل کی سازشوں کے جال پھیلائے گئے۔ کانٹے بچھائے گئے، لیکن وہاں ایک چپ تھی اور ایسی خاموشی کے ہر اقدام کے بعد دشمن پہلے سے زیادہ اپنی ناکامی محسوس کر کے کھسیانی بلی کھمبا نوچے کی تصویر بن جاتا ہے۔

حیات جاوداں دیتا ہے دنیا کو پیام ان کا
خدا ہی جانتا ہے کس قدر پیارا ہے نام ان کا

معزز حاضرین!

ہجرت کے بعد جب آپ ﷺ کھل کر تیر و تفنگ کے میدان میں آتے ہیں تو آپ ﷺ ایک سپہ سالار کی حیثیت سے اپنے ہر سپاہی کے لئے ایک راہ متعین کر دیتے ہیں۔ اس جنگ کے میدان کی بھیانک غار میں بھی یہ راہ انتہائی حسن و جمال کا مرقع ہے۔ سب سے پہلا سبق اللہ تعالیٰ کی راہ میں صرف ان سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اگر وہ صلح کی طرف جھک جائیں تو تم بھی جھک جاؤ غرض آپ ﷺ نے فرمایا ہماری جنگ ملک گیری کی جنگ نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے پیام کو عام کرنے کے لئے ہے۔

جنگ کافر فتنہ و غارت گری است
جنگ مومن سنت پیغمبری است

صدر گرامی قدر!

سپہ سالار کی عظمت کا راز اس بات میں ہے کہ دشمن پر ہر وقت نظر رکھے، اس کی عسکری قوت، اس کے انداز جنگ، سامان حرب اور اس کی سازشوں اور فتنہ انگیزیوں بلکہ فطرت و جبلت تک اس کی نظروں سے اوجھل نہ رہے اس کے مقابلے کے لئے ہمہ وقت تیار رہے اور اپنے سپاہیوں میں جذبہ جان فروشی اس طرح پیدا کر دے کہ جھپٹے تو باز بن کر۔ دفاع کرے تو سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر، حلقہ یاراں ہو تو بریشم کی طرح نرم اگر ہو جنگ تو فولاد بن کر دشمن کی کمر توڑ کر رکھ دے فاتح ہو تو فتح کے نشے میں بوڑھوں، بچوں، عورتوں اور ہتھیار ڈالنے والوں کی مجبوری سے فائدہ نہ اٹھائے۔ فصلوں درختوں کے لئے آگ کا طوفان نہ بنے بلکہ امن و آشتی کا پیغام بن جائے۔

ڈوبا تو نکالا ہے پھسلا تو سنبھالا ہے
میں بھول نہیں سکتا احسان محمد ﷺ کا

اے کرسی صدارت کو رونق بخشنے والے عظیم انسان!

وہ سپہ سالار اعظم، جب میدان جنگ میں اترتا ہے تو اپنے سپاہیوں کو حکم دیتا ہے۔ دیکھنا جوش انتقام میں اندھے نہ ہو جانا، بلکہ ہوش کا دامن تھامتے ہوئے خوف خدا سے کام لینا اور حکم دیتا ہے کہ دشمن کو تہہ تیغ کرنا مگر خیانت نہ کرنا، کسی سے دھوکا نہ کرنا۔ کسی کی لاش کا مثلہ نہ کرنا، کسی بچے کو قتل نہ کرنا، بچوں، عورتوں اور مزدوروں کو قتل نہ کرنا۔ آپ نے اپنے فوجیوں کو کھیت اجاڑنے، درختوں کو بے ضرورت کاٹنے، شیر خوار بچوں اور جانوروں کو قتل کرنے اور کنوؤں میں زہر ملانے سے منع فرمایا۔ آج مہذب کہلانے والا معاشرہ آپ کی اس حکمت کو ملاحظہ کرے۔ کہ آپ نے جنگ جیسی خوفناک چیز، کو بھی رحم و کرم کا آئینہ دار بنا دیا۔ میں آپ کے ذہن کے دریچوں پر دستک دیتا ہوں۔ بتاؤ کیا فتنہ و فساد کی آگ بجھانا اور معاشرہ کے امن و امان کو غارت کرنے والوں کی بیخ کنی کرنا نوع انسانی کیلئے رحمت نہیں۔ یہ وہی کر سکتا ہے جس کے سر دنیا کا سب سے عظیم سپہ سالار ہونے کا تاج زیب دیتا ہے۔

کی محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں

فلک پر چمکتے ہوئے چاند نے بھی
پیمبر کی انگلی کو تعظیم دی ہے
کبھی دائیں جھک کر کبھی بائیں جھک کر
ہمیں بھی غلامی کی تعلیم دی ہے

اے صدر ذی احتشام اور حاضرین محترم!

انسان کی فکر و دانش نے مریخ وثریا کو زیر قدم کر لیا ہے۔ چاند کی سرزمین کو کئی ایک انسان اپنے پاؤں سے روند چکے ہیں۔ فضاؤں اور خلاؤں کی بسیط وسعتوں کو ناپا جا چکا ہے۔ زمین کی پنہائیوں کی عمیق گہرائیوں تک رسائی حاصل کی جا چکی ہے۔ سمندر کا چپہ چپہ کھنگال مارا ہے۔ لیکن اس تسخیر کائنات میں مصروف انسان نے اس طرف توجہ ہی نہیں دی۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا
جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا
زندگی کی شب تار کی سحر کر نہ سکا

حضرت انسان کی سوچ وفکر کے زاویئے نے کبھی اپنا رخ اس طرف موڑا ہی نہیں کہ میری زندگی کا حاصل کیا ہے اور کیا میری زندگی کی منزل اور کیا میرا مقصد تخلیق یہی ہے۔ کہ میں ان چاند ستاروں کے پیچھے دوڑتا پھروں جن کے مسخر ہونے اور میرا غلام بنائے جانے کا اعلان چودہ سو سال پہلے کیا جا چکا ہے۔ ابھی اس پر یہ راز منکشف ہی نہیں ہوا۔ کہ

چاند پر پہنچ جانا حقیقت سہی
چاند قدموں میں لانا بڑی بات ہے

جناب محترم!

کسی حقیقت شناس اور نگاہ رسا کے مالک نے کیا خوب کہا تھا کہ دنیا اور مافیھا ایک سائے کی مانند ہیں۔ اس سائے کی طرف جتنا دوڑ و گے یہ مزید آگے بلکہ اور آگے بڑھے گا اور اگر اس سے دامن چھڑا کر سمت مخالف چلو گے تو یہ سایہ تمہارے پیچھے پیچھے آنے پر مجبور ہو گا۔ اس لئے آج کے اس ترقی یافتہ دور میں کوئی انجینئر، کوئی سائنس دان مکمل تسخیر کائنات کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ جبکہ تقدیر کے قاضی کا فتویٰ صفحات قرآن میں آج بھی مرقوم ہے۔ کہ

لَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ﴿۱۳۹﴾

(آل عمران)

یعنی اے بندہ مومن اگر تو اسم محمد ﷺ سے اپنے دل میں اجالا کرلے۔ اگر احمد مرسل ﷺ کی غلامی اپنے دل میں مقامی کرلے تو یہ بادل، یہ گھٹائیں، یہ گنبد افلاک کی خاموش فضائیں، یہ کوہ وصحرا، یہ سمندر یہ ہوائیں، یہ سب کچھ تمہارے تصرف میں ہوں گے۔

اگر دنیا پر چھانے کا ارادہ ہو تمامی کا
گلے میں پہن لو تمغہ محمد ﷺ کی غلامی کا

حضرات باتمکین!

ایک کوتاہ بیں کی نظر میں دولت وثروت کی ریل پیل کامرانی کا زینہ ہے۔ مادیاتی دنیا کا پروردہ ذہن، دنیوی رعنائیوں اور وقتی لذتوں میں فرحت وانبساط تلاش کرتا ہے جسم ظاہر کے آرام وسکون کو چین وقرار سے تشبیہہ دیتا ہے۔ اس لئے تن آسانی اور تن پروری کے لئے محیر العقول آلات اور اشیاء منصۂ شہود پر لاچکا ہے۔ خورد ونوش اور کام ودہن کے ذائقے کے لئے بیسیوں قسم کے کھانے پھل مٹھائیاں مشروبات پر تجربات کر رہا ہے۔ ایک مٹی کے دیئے سے ترقی کر کے ہزارہا قسم کی برقی روشنیاں قمقمے، لائٹیں، ایجاد کر کے ویرانوں، سڑکوں، گلیوں اور گھروں کو بقعۂ نور بنا چکا ہے۔ لیکن کیا یہ حقیقت نہیں ہے۔ کہ

آجکل کی روشنی نے کر دکھائے کام دو
گھر کو روشن کردیا دل میں اندھیرا کر دیا

اے صدر ذیشان اور حضرات محترم!

دل کی دنیا میں روشنی درکار ہو تو یہ صرف اس در سے میسر ہو سکتی ہے۔ جس کی خاطر تخلیق کائنات کا کھیل رچایا گیا ہے۔ اور جن کی غلامی سے عرب کے گڈریے ہمدوش ثریا ہو گئے۔ ان کے انگلی کے اشارے تقدیر الٰہی بن گئے ان کے دل کی دھڑکن اور ان دھڑکنوں میں بسنے والے خیالات کی ترجمانی آیات قرآنیہ سے ہونے لگی، تاج قیصر و کسریٰ کے کروفران کے پاؤں کی دھول بن گئے۔ یہ فضائیں، یہ ہوائیں ان کی مواصلاتی پیغام رساں بن گئیں۔ جنگلوں بیابانوں کے چرند پرند اور درندان کے حکم کے سامنے سرتسلیم خم کرنے لگے۔

جو کرنی ہو جہانگیری محمد ﷺ کی غلامی کر
عرب کا تاج سر پر رکھ خداوند عجم ہو جا

اے ملک وملت کے باشعور باشندو!

اب آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اے محمد مصطفیٰ ﷺ کے باوفا شاہینو! اور ان دیکھے خدا پر پختہ یقین کے پیکرو! یہ تاریخ ہماری ہے۔ یہ ہمارا وہی گردوں ہے جس کے ہم ٹوٹے ہوئے تارے ہیں۔ وہ غازی وہ پراسرار بندے ہمارے ہی آباء تھے۔ اگر آج ہم محمد ﷺ کی غلامی اختیار کرلیں جو زبانی دعوؤں تک محدود نہ ہو۔ بلکہ عشق ومحبت کی وارفتگی میں ہماری زندگی کا ہر سانس اور ہمارے دل کی ہر دھڑکن ان کے حکم کی پابند ہو جائے۔ تو گردوں سے فرشتے قطار اندر قطار ہماری نصرت کو اب بھی اتر سکتے ہیں۔ آگ آج بھی انداز گلستان اختیار کرسکتی ہے۔ آج بھی کئی خشک دریاؤں کے سوتے ہمارے حکم کے منتظر ہیں۔ کئی دارا و سکندروں کے تاج ہماری راہ دیکھ رہے ہیں جو اس خون عرب کی قبا سے آج رنگین ہونا چاہتے ہیں انتظار تو اس بات کا ہے کہ تیرا ضمیر کب جاگتا ہے اور فطرت کی آواز کب سنتا ہے جو کہہ رہی ہے کہ۔

کی محمد ﷺ سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح وقلم تیرے ہیں

انسان اور کائنات

صدر ذی قدر اور حاضرین محترم!

اس کائنات کا خالق و مالک اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک ہے۔ وہی اس کائنات کے نظام کو بہترین انداز سے چلا رہا ہے اور لاکھوں صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کے خوبصورت نظم و ضبط میں آج تک کسی قسم کی کمی یا کجی پیدا نہیں ہوئی۔ خود ذات باری تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا:

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ؕ فَارْجِعِ الْبَصَرَ ۙ هَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۝ (الملک)

''یعنی رحمٰن کی صنعت میں کوئی نقص نہیں نکال سکے گا۔ ذرا دیکھ تجھے کوئی عیب نظر آیا ہے''۔

ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ كَرَّتَيْنِ يَنْقَلِبْ اِلَيْكَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّهُوَ حَسِيْرٌ ۝

''یعنی تم آسمان کی طرف دوبارہ نگاہ اٹھا کر دیکھو تمہاری آنکھیں تھک ہار کر واپس لوٹ آئیں گی اور آسمان کی تخلیق میں کوئی نقص نظر نہیں آئے گا''۔ (الملک)

گویا جس نے اس کائنات کو بنایا وہی اس کو بہترین انداز سے چلا سکتا ہے اور کائنات اس کے حکم کی پابند ہے۔ اس کائنات میں اپنا نظم و ضبط اور طریق کار اختیار کرنے کے اختیارات دیئے گئے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ انسانوں میں جس جس نے بھی دنیا کی زندگی کو اپنی سوچ اور فکر کے زاویے سے بسر کرنے کی کوشش کی وہی راہ راست سے بھٹک گیا۔

جب پڑھی اہدنا الصراط تو آئی یہ صدا
طیبہ کے رخ چلو کہ یہ راہ مستقیم ہے

حضرات محترم!

اللہ تعالیٰ نے حضرت انسان کو اگر چہ بے شمار اختیارات دیئے لیکن اس کی راہنمائی کے لئے اپنے برگزیدہ بندے انبیاء کرام کو بھی بھیجتا رہا۔ جو حضرت انسان کی راہنمائی کرتے رہے کہ جو راستہ بھی تم اختیار کرو گے۔ اس راستے میں بے شمار خطرات ہیں۔ بھٹکنے کے اندیشے ہیں یہ راستے پر خار ہیں۔ ان راستوں میں چلنا جہنم کے گڑھے تک پہنچا دیتا ہے۔ لیکن ایک راستہ ایسا بھی ہے۔ جو اس ذات نے بنایا ہے۔ جس نے ساری مخلوق کو تخلیق کر کے اس کو بہترین نظم وضبط دیا ہے۔ لاکھوں کروڑوں سال گزر جانے کے باوجود اس کائنات کے نظام میں نقص پیدا نہیں ہوا۔ اسی ذات کا بنایا ہوا اور بتایا ہوا راستہ ہے۔ وہ راستہ ایسا ہے جس راستے پر چلنے والے ہمیشہ کامیاب وکامران رہے ہیں۔

راہ وفا میں ہر سو کانٹے، دھوپ زیادہ، سائے کم
لیکن اس پر چلنے والے خوش ہی رہے، پچھتائے کم

حضرات باتمکین!

وہی راستہ آج ہمارے زیب گفتگو ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب ﷺ کی وساطت سے پوری دنیا کے انسانوں کو بتایا کہ

قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى (بقرہ:120)

یعنی اے محبوب ساری کائنات انسانی سے فرمادے کہ اصل ہدایت کا راستہ وہی راستہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا راستہ ہے۔ نبی کا راستہ ہے۔ نیک لوگوں کا راستہ ہے اور اللہ کے بندوں کا راستہ ہے۔

ہر دو عالم میں تجھے مقصود گر آرام ہے
ان کا دامن تھام لو جن کا محمد ﷺ نام ہے

اے صدر ذی احتشام!

آخر میں میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ جس طرح پوری کائنات کے نظم میں آج تک کوئی نقص پیدا نہیں ہوا۔ اسی طرح یہ حقیقت تسلیم کئے بغیر چارہ نہیں کہ اس کے بنائے ہوئے راستے پر چلنے والے کبھی گمراہی، تکلیف، پریشانی، الجھن اور گومگو کی کیفیات کا شکار نہیں ہوتے۔ خود بھی دنیا کے ہر قسم کے دکھوں کی دھوپ سے بچے رہتے ہیں اور پوری دنیا کے لئے شجر سایہ دار بھی بن جاتے ہیں۔

انہی کے دم سے ہیں دنیا میں صبح عید کے جلوے
مسلمانوں کی کثرت سے عیاں توحید کے جلوے

میں جانتا ہوں موت ہے سنت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی

موت ہے ہنگامہ آراء قلزم خاموش میں
ڈوب جاتے ہیں سفینے موج کی آغوش میں

صدر ذی وقار اور ارباب بزم!

موت ایک خوفناک تصور رکھتے ہوئے بھی ایک زندہ حقیقت ہے۔ اس سے کسی طرح بھی فرار ممکن نہیں۔ ہر ذی شعور اور غیر ذی شعور بلکہ ہر متنفس کو یہ کڑوا گھونٹ چاروناچار ضرور پینا ہے۔ اس ذائقہ کو کڑوا تو میں اس خوف کی بنا پر کہہ رہا ہوں جو مجھ پر طاری ہے ورنہ آج تک کوئی شخصیت ایسی نظر نہیں آئی اور نہ کہیں مل سکے گی جس نے یہ مزہ ایک بار چکھا ہو اور پھر آ کر بتایا ہو کہ اس کا ذائقہ کیسا ہے، البتہ اللہ والے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو ہر آن جان کی بازی لگانے کے لئے تیار رہتے ہیں یا جن بزرگان دین وشہداء کرام کے مقدس تذکرے جو ہماری تاریخ کا سنہری باب ہیں، پڑھنے اور سننے میں آتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ

موت کے پردے سے کم ہوتی نہیں ہے زندگی
اس طرف بھی زندگی ہے اس طرف بھی زندگی

زیب موضوع آیہ مبارکہ کُلُّ نَفۡسٍ ذَآئِقَةُ الۡمَوۡتِ (آل عمران:185) قدرت خداوندی کا ایک اٹل اصول ہے لیکن اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں سے حضرت انسان ایک ایسا متنفس ہے جو اس حقیقت کو پہچانتے ہوئے بھی ہزاروں نفوس کو اپنے ہاتھوں منوں مٹی کے نیچے دفن کرتے ہوئے بھی اپنا انجام ایک اندھا گڑھا، اس کے اوپر پتھر کی سلیں، پھر دوستوں، عزیزوں، اپنوں، بیگانوں کو مٹی کی مٹھیاں بھر بھر سر پر ڈالتے دیکھتے ہوئے بھی سب کچھ بھول جاتا ہے۔ قبرستان سے باہر آئے، نہ یاد نبی رہی نہ خوف خدا رہا۔

رہی یاد نبی باقی نہ خوف کبریا باقی
یہی جاتا رہا ساماں تو پھر کیا رہ گیا باقی

حضرات والا کرم!

ہوسکتا ہے کہ لوگوں کے اذھان میں یہ چیز سمائی ہوئی ہو کہ موت جو ہر متنفس کے لئے لازمی امر ہے، وہ سانس کی کچی ڈوری کے ٹوٹ جانے کا نام ہے۔ حالانکہ دنیا کے عظیم دانشور، منبع فکر و حکمت، مرکز راہ ہدائت، ہادی انس و جان، محسن انسانیت حبیب کبریا، احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ ﷺ کا ارشاد مجھے میری سوچ کے زاویے بدلنے کی تربیت دے رہا ہے۔

آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

مَثَلُ الَّذِیْ یَذْکُرُ اللّٰهَ وَ مَثَلُ الَّذِیْ
لَمْ یَذْکُرِ اللّٰهَ مَثَلُ الْحَیِّ وَالْمَیِّت

''یعنی وہ شخص جو ذکر الٰہی اور یاد خدا سے غافل ہے، اس کی مثال ایک مردہ کی سی ہے او جو یاد پروردگار میں مصروف رہتا ہے اس کی مثال ایک زندہ کی ہے''۔

گویا ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ دنیا میں رہ کر بھی، ایئر کنڈیشنڈ کمروں، کاروں، گھروں میں بیٹھ کر بھی، ہوائی جہاز میں پرواز کرتے ہوئے بھی، عالی شان محلات میں داد عیش لیتے ہوئے بھی اور فیشن پرستی کی جدید حدود کو عبور کرتے ہوئے بھی جو لوگ ہمیں چلتے پھرتے نظر آتے ہیں۔ اگر یہ یاد خدا سے غافل ہیں تو یہ زندہ نہیں ہیں، مردہ ہیں۔ زندگی تو یاد محبوب سے عبارت ہے۔ یاد الٰہی سے غفلت دل کی موت ہے۔

زندگی زندہ دلی کا نام ہے
مردہ دل کیا خاک جیا کرتے ہیں

وہ لوگ جو اپنے خالق و مالک کے انعامات و اکرامات کے ہر آن شکر گزار رہتے ہیں۔ وہ اگر بظاہر مر بھی جائیں، ان کو کفن بھی دے دیا جائے، دفن بھی کر دیا جائے، ان کی رسم قل بھی ہو جائے، وہ پھر بھی زندہ ہیں۔

کون کہتا ہے کہ مومن مر گئے
قید سے چھوٹے وہ اپنے گھر گئے

حضرات محترم!

دنیا میں مختلف قسم کے لوگ بستے ہیں۔ کچھ جینے کی تمنا کرتے ہیں کہ ان کا ابھی مرنے کو جی نہیں چاہتا یا ان کی خواہشات ابھی پوری نہیں ہوئیں۔ بیوی بچوں کی محبت نے انہیں ابھی دنیا سے بیزار نہیں ہونے دیا۔ دنیا کی رنگینیاں، رعنائیاں اور دلفریبیاں دامن دل کو کھینچے ہوئے ہیں۔ لیکن کچھ لوگوں کو دنیاوی زندگی اس لئے عزیز ہوتی ہے کہ ان کے نزدیک زندگی کا ایک خاص مقصد ہے جو ابھی پورا نہیں ہوا اور وہ کہتے پائے جاتے ہیں۔

اے موت ابھی اور ہے جینے کی تمنا
ہے تشنۂ تکمیل مدینے کی تمنا

اور کچھ لوگ تو ہم نے ایسے بھی دیکھے ہیں جو موت کو ایک خاص وقت میں مانگتے ہیں۔

پائے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ہے میرا سر جھکا ہوا
ایسے میں آ اجل تو کہاں جا کے مر گئی

اور کچھ ایسے بھی ہیں جن کے لئے زندگی وبال جان ہے۔ تمام دوست ساتھ چھوڑ گئے۔ اپنے بیگانے ہو گئے۔ اعضاء جواب دے گئے۔ بیماری وعلالت طوالت اختیار کر گئی۔ بستر مرگ پر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مرنے کو بے چین ہیں اور ہر وقت شکوہ کناں ہیں۔

لیکن حضرات محترم!

ان تمام حقائق وواقعات کے ہوتے ہوئے بھی جو بات سمجھ میں آتی ہے وہ یہ ہے کہ موت ہر ایک کو آنی ہے لیکن کسی کی خواہش کے مطابق کسی کو نہ قبل از وقت آسکتی ہے اور نہ اس میں تاخیر ممکن ہے۔ اس کا ایک وقت مقرر ہے۔

فَاِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ لَا يَسْتَاْخِرُوْنَ سَاعَةً وَّ لَا يَسْتَقْدِمُوْنَ۝

''جب وقت مقرر آ جائے گا تو پھر موت ایک لمحہ کے لئے نہ مقدم ہو سکتی ہے نہ

مؤخر''۔(الاعراف)

آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ دنیا دارالعمل ہے۔آج کریں جو کچھ کرنا ہے کل کام آئے گا۔مرنے کے بعد سب کا رونا دھونا اپنے لئے ہوگا۔کون کسی کے لئے روتا ہے۔

کوئی نہ رووے اماں نوں
سب رون اماں دے کماں نوں

اس لئے کہ موت تو ایک ایسا عمل ہے۔جس سے فرار ممکن نہیں کیوں نہ ہم ہمہ وقت اس کے لئے تیار رہیں۔اندھیری قبر میں روشنی کے لئے ایک عظیم شخصیت کی محبت کا داغ لے کر چلیں۔

وہاں ایک محفل سجا رکھنے کو ان کی یاد کے لمحات جمع کر رکھیں اور وہ وہاں کام آئیں گے۔

لحد میں عشق رخ شاہ کا داغ لے کے چلے
اندھیری رات سنی تھی چراغ لے کے چلے

اسلام کی برکات

چاہتے ہو تم اگر نکھرا ہوا فردا کا رنگ
سارے عالم پر چھڑک دو گنبد خضریٰ کا رنگ

صدر گرامی قدر!

زندگی تو بہر طور گزر جاتی ہے۔ بے راہ روکی بھی اور راہ راست پر چلنے والے کی بھی لیکن ایک زندگی بھر ٹھوکریں کھاتا رہتا ہے۔ دوسرا ٹھوکروں میں گرنے والوں کے لئے بھی پیغام زندگی بن جاتا ہے۔ زندگی کے ان دو مختلف زاویوں کو سامنے رکھتے ہوئے دنیا کے بڑے بڑے راہنماؤں، دانشوروں اور عظیم راہبروں نے غور وفکر کیا اور زندگی کو احسن طریقے سے گزارنے کے لئے رہنما اصول مرتب کئے۔ کیمونزم، بدھ ازم، سوشل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ یہ تمام راستے زندگی کو بہتر سے بہتر گزارنے کے لئے بنائے گئے لیکن وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ یہ راستے تو مزید اندھیروں میں الجھا دیتے ہیں۔ ان راستوں کے بنانے والے خود کئی ٹھوکریں کھا بیٹھے ہیں۔ پس منظر میں کوئی دل کی عمیق گہرائیوں میں ڈوب کر مشورہ دیتا ہے۔

دشت طلب میں تنہا نکلو یا پھر اس کے ساتھ چلو
جس کی ٹھوکر راہ نکالے راہ میں ٹھوکر کھائے کم

دل کی دنیا کو یہ مشورہ اچھا لگا اور ایسے رہنما اور ہادی کی تلاش میں نکلا جس کی ہر ٹھوکر سے ایک نئی راہ نکلتی ہو اور وہ خود بھی کبھی ٹھوکر نہ کھاتا ہو بلکہ نظام کائنات کا ذرہ ذرہ اسی کے دم سے قائم ہو۔

اشک سچے ہوں تو کبھی ضائع نہیں جاتے
میری پلکوں سے گرے ان کے قدم تک پہنچے

حاضرین باتمکین!

میری طلب اور جستجو کی سچائی کی لاج رکھتے ہوئے فطرت خداوندی کی طرف سے آ گہی کی روشنی کی کرن پھوٹی کہ اَسلِمْ تَسلِمْ اسلام قبول کرے نجات پا جائے گا جھک جا، ابھر جائے گا امن اسی میں ہے۔ سلامتی اسی میں ہے۔ سکون و راحت اور چین و قرار کی دولت یہی ہے۔

اگر دنیا پہ چھانے کا ارادہ ہو تمامی کا گلے میں پہن لو تمغہ، محمد ﷺ کی غلامی کا

ورنہ ٹھوکریں کھاتے پھرو گے اور زندگی کی ہر خاردار اور کانٹوں والی راہ میں الجھتے رہو گے۔ عبادت کرتے ہوئے اپنے ہی بنائے بتوں کے آگے جھکتے تمہیں شرم نہیں آئے گی اپنی معاشرتی زندگی کے بنائے ہوئے قانون کی دھجیاں اڑاتے ہوئے تمہیں حیا نہیں آئے گی۔ ظلم و ستم کی چکیوں میں اپنے ہی جیسے انسانوں کو پیستے ہوئے تمہارا ضمیر نہیں جاگے گا۔ درندوں کی درندگی تمہاری درندگی کے سامنے پانی پانی ہو جائے گی۔ لیکن تمہاری انسانیت بیدار نہیں ہوگی۔ نفرتوں کے بیج اپنی ہر راہ میں خود بوتے رہو گے اور تمہیں اس کا شعور بھی نہ ہوگا۔ خبر اس وقت ہوگی جب سانس کی ڈوری کا کچا دھاگا ٹوٹ جائے گا ہر طرف سے نفرتوں کے تیر تمہارے جسم میں پیوست ہو رہے ہوں گے۔ لیکن تم چیخ بھی نہیں سکو گے۔ تمہارا کوئی پرسان حال نہ ہوگا۔ کوئی بے بسی سی بے بسی ہوگی۔ اس کرب، دکھ اور تکلیف کے عذاب سے نجات کا صرف ایک راستہ ہے، صرف ایک راستہ ہے اور وہ ہے اسلم تسلم اسلام قبول کرو۔ پناہ میں آ جاؤ گے۔

کیا تمازت دھوپ کیسی اور کہاں کی حدتیں

ان کا دامن تھام لو پھر حشر تک سایہ بہت

اے دنیا کے بکھرے اور الجھے ہوئے انسانو!

فَاَیْنَ تَذْھَبُوْنَ۝ (تکویر)

تم کدھر جا رہے ہو۔ آنکھیں کھولو، ہوش سنبھالو، دامن توحید و رسالت ﷺ ہی ایک

ایسی راہ ہے۔ ایک ایسا راستہ ہے۔ ایک ایسا راہ عمل ہے۔ جو بکھرے ہوؤں کو یکجا کرتا ہے۔ الجھے ہوؤں کو سلجھاتا ہے۔ منتشروں کو ملاتا ہے۔ اخوت و بھائی چارہ کے ساتھ عربی عجمی، رومی وشامی، کالے گورے، اچھے برے، اپنے بیگانے سب کو ایک خوبصورت مالا میں پرد دیتا ہے اور وہ محمد عربی ﷺ کی راہ ہے۔ وہ نظام مصطفیٰ ﷺ ہے۔

عربی عجمی و رومی شامی کے بکھرے دانوں کو یکجا کر کے
بنا دی پیاری سی ایک مالا ، یہ مالا کتنی سجی ہوئی ہے

صدر گرامی!

خام طلب کے باعث منزل کا قرب بھی طویل مسافت پر نظر آنے لگتا ہے۔ قرب د بعد، دراصل اضافی امور ہیں۔ طلب کے صدق و کذب سے ہی ان کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قصر شیریں عقلی نقطہ نگاہ سے دور ہو سکتا ہے۔ عقل کو وہاں تک رسائی مشکل نظر آتی ہے۔ لیکن فرہاد کے لئے دور نہیں وہ اپنے تیشے کے ساتھ اس دوری کو دور کرنے کے لئے تیار ہو جاتا ہے۔ وادی نجد اور منزل لیلیٰ میں لاکھ فاصلہ سہی لیکن قیس عامری کا ولولہ شوق اس مسافت کو تسلیم نہیں کرتا اس کے لئے تو دو ہی قدم ہے۔

جب تیری قربت کا گماں ہوتا ہے
فاصلے فاصلے نہیں رہتے

جس کے پاس ولولہ اور شوق کی متاع موجود ہو اس کے سینے سے جذبات کے طوفان اٹھ رہے ہوں۔ اس کو محروم نہیں کہا جا سکتا ہے۔ محرومی تو اس مسافر کا حصہ ہوا کرتی ہے جو منزل کے شوق سے محروم ہو۔

حضرات!

طلب صادق کا دوسرا نام لگن ہے۔ جس ذات سے لگن ہو اس کی جفائیں بھی کیف آور ہوتی ہیں او جس سے لگن نہ ہو اس کی عطائیں بھی مزہ نہیں دیتیں۔ ماں کو بچے سے لگن ہوتی ہے۔ اس کی توتلی زبان سے نکلی ہوئی باتیں بھی ماں کی روح میں کیف و مستی پیدا کر دیتی

ہیں۔ وہ جب پیار سے اماں کہتا ہے۔تو ماں کا دل مستیوں اور سرشاریوں سے بھر جاتا ہے۔
مجھے وہ حدیث مبارکہ یاد آتی ہے۔جس میں رحمت کائنات صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے صحابہ کرام کو چڑیا اور
اس کے بچوں کی ممتا اور شفقت پر تعجب کرنے پر ارشاد فرمایا تھا۔تمہیں ماں کی ممتا پہ تعجب آرہا
ہے۔حالانکہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس بھی زیادہ پیار ہے۔اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے۔

وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ (بقرہ:186)

''میرا بندہ جب مجھے ایک بار پکارتا ہے تو میں اس کا دس مرتبہ جواب دیتا
ہوں۔یہ سب محبت ولگن ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں''۔

صدرگرامی قدر!

بیمار جسم کو غذا مزا نہیں دیتی۔اسی طرح بیمار روح کو اللہ تعالیٰ کا نام لینے میں مزا نہیں
آتا۔تعلق ہی نہ ہو۔تو مزہ کیسا؟ لگن ہی نہ ہو تو مستی کیسی؟ سوتیلی ماں کو بچہ لاکھ بار اماں کہہ
کے پکارے اس کی پکار بے اثر ہوگی۔الغرض

چاہتے ہو تم اگر نکھرا ہوا فردا کا رنگ
سارے عالم پر چھڑک دو گنبد خضرا کا رنگ

تیری بنیادوں میں ہے لاکھوں شہیدوں کا لہو

یہ شہادت اک سبق ہے حق پرستی کیلئے
اک ستون روشنی ہے بحر ہستی کیلئے

صدر ذیشان اور حاضرین وسامعین!

آج میں خلاف معمول آپ سے مخاطب نہیں اپنے وطن عزیز سے مخاطب ہوں کہ اے میری مادر وطن! تیری بنیادوں میں لاکھوں شہیدوں کا لہو ڈال کر میں نے تیری اس مقدس عمارت کو تعمیر کیا ہے۔ بہت پہلے کی بات ہے کہ میں تیری تلاش میں پھرتا رہا۔ ہزاروں خزاؤں کی تپش نے میرے گلہائے امید وحسرت کو خاکستر کیا لاکھوں بہاریں آئیں لیکن میری خواہشوں اور حسرتوں کی کلیاں بن کھلے مرجھا گئیں۔ مخالفتوں، نفرتوں، منافقتوں کے تھپیڑے سہتا رہا لیکن میں تیری تلاش میں، راہ وفا پر گامزن رہا۔ اگرچہ اس کی راہ میں دھوپ ہی دھوپ تھی اور سائے کم تھے۔ لیکن تجربے نے ثابت کر دیا کہ اس راہ پہ چلنے والے ہمیشہ خوش ہی رہے ہیں۔ پچھتائے نہیں نتیجۃً کشتی امید کنارے لگتی نظر آئی اور ایک ایسا راہبر اور ہادی، قسمت سے مل گیا جس کی ہر ٹھوکر سے ایک نئی راہ تشکیل ہوتی تھی۔ بظاہر نحیف و نزار، لاغر، ہڈیوں کا ڈھانچہ، لمبا تڑنگا تھا لیکن عزم کا کوہ گراں۔ فہم وفراست کی دنیا کا بادشاہ، سیاست عالم کے لئے ایک روشن مثال محمد علی جناح کہ جس کے نام پر بھی رب کا سایہ ہے۔

بار الٰہہ میری زباں پہ یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

اے ارض وطن!

وہ میرا قائد آگے بڑھا، تیرا چپہ چپہ اس کی کوششوں کا گواہ ہے۔ ہزاروں بچوں کے بے گناہ لاشے تڑپے اور تیری ممتا کو سکون بخشا، لاکھوں بیٹیوں نے اپنی عزت، تیری عصمت

پر قربان کر دی، لاکھوں ماؤں کی قربانیاں تیری مانگ کا سندھور بنیں، لاکھوں جوانوں کا لہو تیری بنیادوں کی لوریوں کو رنگین کر گیا۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک اے میرے حرم   تیرے کھیتوں کے کھلیان رشک ارم
میں ہوں بیٹا تیرا میری ارض وطن   تو میری ماںتا میری ارض وطن

اے مادر وطن!

میرا تیرا رشتہ بھی بالکل انوکھا اور نرالا ہے۔ مائیں بچوں کو جنم دیتی ہیں۔ لیکن تجھے میں نے جنم دیا ہے۔ مائیں بچوں کو دودھ پلاتی ہیں، جوان کرتی ہیں، میں نے تجھے اپنا خون پلایا ہے اور جوان کیا ہے۔ مائیں بچوں کو سینوں سے چمٹائے رکھتی ہیں اور ان کے بوسے لیتی ہیں۔ میں تیری یادوں کی بارات ہر آن سینے سے لگائے پھرتا ہوں مجھے تیرے چپے چپے سے پیار ہے۔ تو میری جان ہے۔ تیرے پہاڑ جاں فضاء، تیرا موسم دسماں خوش نما۔ تیرے لہکتے ہوئے سر سبز جنگل، تیرے مہکتے باغوں کے منظر، تیری فضاؤں میں بکھری ہوئی خوبصورت گھٹائیں۔ مرے انگ انگ میں رس گھولتی ہیں۔ صرف اس لئے کہ تیری بنیادوں میں لاکھوں شہیدوں کے ساتھ میرا لہو بھی شامل ہے۔

کسی سے نہیں اتنی الفت ہمیں   ہے جتنی وطن سے محبت ہمیں

اب آخر میں عرض کرتا چلوں کہ اے میرے وطن ہمیں احساس ہے کہ ایک فرمانبردار بیٹے کی حیثیت سے تیرا سہاگ نہ بن سکے۔ تیری حفاظت نہ کر سکے۔ تیرا تن زخمی ہوا تیرا خواب نظام مصطفیٰ ﷺ شرمندہ تعبیر نہ ہوا، غیروں اور اپنوں کی سازش سے تیرا ایک بازو کٹ گیا۔ تجھے چرکے لگے۔ بیگانے تیرے لہو کے پیاسے ہوئے۔

اے ارض وطن، تیرے غم کی قسم   تیرے دشمن ہم تیرے قاتل ہم
ہم لوگ جو اب تک زندہ ہیں   اس جینے پر شرمندہ ہیں

اے وطن تو ہمیشہ سلامت رہے

میری آنکھوں کی ٹھنڈک اے میرے حرم
تیرے کھیتوں کے کھلیان رشک ارم
تیری خوشحالیوں کی تمنا لئے
ظفر چشتی جلائے خوشی کے دیئے

حضرات محترم اور صدر ذیشان!

زندگی بذات خود آزادی کے آفتاب کی سنہری کرن ہے۔ زندگی آزادی کے بغیر عذاب ہے۔ آزادی شرف انسانیت ہے۔ غلامی ذلت و رسوائی ہے۔ آزادی کامیابی و کامرانی ہے اور غلامی محرومی و ناکامی ہے۔ آزادی کی حفاظت صرف وہی قومیں کر سکتی ہیں۔ جنہوں نے غلامی کی زنجیریں خود توڑی ہوں۔ کبھی وہ وقت تھا جب پاک و ہند کے مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ اور انگریزوں کے رحم و کرم پر تھے۔ یہی وہ قوم تھی جس نے خالد بن ولید، طارق بن زیاد کو جنم دیا تھا جب اس قوم کے سپوتوں نے انگریز حکومت کے جبر کے خلاف آواز اٹھائی تو اللہ تعالیٰ نے اس قوم پر رحم فرمایا۔ اقبال اور جناح جیسے راہنما انہیں میسر آئے۔ ان کی رہنمائی میں ایک آزاد وطن پاکستان کی صورت میں معرض وجود میں آیا۔

اللہ اکبر کے نعرے جب گونج اٹھے میدانوں میں
سب دشمن ڈر کر بھاگ گئے ہوش اڑے شیطانوں کے

صدر گرامی قدر!

پاکستان کے قیام کے وقت انگریزوں اور ہندوؤں کا خیال تھا کہ یہ ملک چند روز کا مہمان ہے۔ اس کے بعد پھر غلامی کی زنجیروں میں جکڑ لیا جائے گا۔ اس خیال کے پیش نظر

پاکستان کی حد بندی سے لے کر ہر چیز کی تقسیم تک جہاں جہاں بھی اسے نقصان پہنچایا جاسکتا تھا کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پھر قیام پاکستان کے بعد شہ رگ پاکستان کشمیر پر قبضہ کرلیا۔ قائداعظم محمد علی جناح کا جنازہ ابھی پڑا ہے اور پوری قوم اس سوگ و تعزیت میں ہے کہ (رن کچھ) پر ظالمانہ قبضہ کرلیا۔ 1965ء کی جنگ ہندوؤں کے ناپاک عزائم اور خباثت باطنی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ لیکن ہندوؤں کی ٹڈی دل فوج کے دانت پاک فوج نے اس طرح کھٹے کردیئے اور ایسے کاری زخم لگائے کہ ایک عرصہ تک ان زخموں کو چاٹتے رہے۔ پاک فوج نے ان پر ثابت کردیا کہ ہم میں آج بھی وہی خون ہے۔ جو ٹیپو سلطان شہید، حیدر علی، یوسف بن تاشفین اور محمد بن قاسم کی رگوں میں جوش مارتا تھا۔ ستمبر 65ء کی جنگ میں پاک وطن کا بچہ بچہ کٹ مرنے کے لئے تیار ہوگیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ پاک وطن کے عوام جیالوں نے اپنے وطن، اپنے دین اور ملک وملت کی خاطر تن من دھن نچھاور کر دیا۔ اس جنگ میں عوام اور فوج کا حوصلہ اور ان کی ہم آہنگی کی تاریخ عالم میں مثال نہیں ملتی۔ ہر شخص اپنے وطن کی حفاظت کی خاطر اپنی جان ہتھیلی پہ رکھے ہوئے تھا۔

ٹل نہ سکتے تھے اگر میدان میں اڑ جاتے تھے
پاؤں شیر زوروں کے بھی میداں سے اکھڑ جاتے تھے

صدر محترم اور ارباب محبت!

وطن عزیز کا ذرہ ذرہ ہمیں اپنی جان سے عزیز تر ہے۔ اس کے کھیتوں کے کھلیان، اس کی پگڈنڈیاں، اس کے شہر، اس کے قریے، اس کے پہاڑ اور اس کی مسجدوں کے مینار ہماری آن ہیں اور ہم اپنی آن کی حفاظت کرنا خوب جانتے ہیں۔

اس ملک وملت کی خاطر ہی مرنا ہے اور جینا ہے
اس ارض وطن پر کر ڈالو نذرانے اپنی جانوں کے

شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے

جب تک جلیں نہ دیپ شہیدوں کے لہو سے
سنتے ہیں کہ جنت میں چراغاں نہیں ہوتا

اے مسند صدارت کی رونق اور ارباب محفل!

کائنات کا ہر ذرہ اس امر کی شہادت دیتا ہے کہ قربانی دیئے بغیر زندگی ممکن ہی نہیں وہ حیات فانی ہو یا ابدی ہر دو حیات ایثار کی مرہون منت ہیں، ہم ایک تن آور درخت کو کاٹتے ہیں۔تو اس کی پیاری اور ٹھنڈی چھاؤں سے محرومی کا احساس ہوتا ہے۔لیکن درخت زبان حال سے پکار کر کہتا ہے۔کہ میرا کٹنا بے کار نہیں جائے گا بلکہ میں تو ڈوبنے والوں کے لئے کشتی بنوں گا۔ گھروں کی حفاظت کے لئے دروازے اور کھڑکیاں بنوں گا۔ آرام و راحت کے لئے میز و کرسیاں بنوں گا میری موت تو قوم کے لئے حیات ہے۔اس طرح جب کسان ایک دانہ کو مٹی اور کیچڑ میں دباتا ہے۔تو دانہ کہتا ہے۔اے میرے مالک! میں تیرے ہاتھوں مٹی میں اس لئے مل رہا ہوں کہ تیرا گھر دانوں سے بھر دوں میرا خاک میں ملنا مجھے بھی گل و گلزار کا حسین زیور پہنائے گا اور تجھے بھی خوشحالی بخشے گا پھر تو پنڈال میں شملہ اونچا کر کے بیٹھے گا۔

شہادت کا لہو جن کے رخوں کا بن گیا غازہ
کھلا ہے ان کی خاطر دائمی جنت کا دروازہ

اے ارباب بزم!

وہ کڑیل جوان جو شہادت کی تمنا لئے ہوئے ہے۔اس کی پرورش میں پوری قوم کا سرمایہ صرف ہو رہا ہے۔کوئی اسے عسکری تربیت دے رہا ہے۔کوئی اس کے لئے آب و دانہ کا انتظام کر رہا ہے۔کوئی اس کے لئے لباس تیار کر رہا ہے۔کوئی اس کی خوابیدہ صلاحیتوں کو بیدار کر رہا ہے۔آپ کو خبر ہے کہ یہ تمام لوگ اس ایک جیالے سپاہی کے لئے اپنی تمام تر

صلاحیتیں کیوں صرف کر رہے ہیں۔صرف اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ ہمارا دین، ہماری دنیا، ہمارا وطن، ہماری ملت، ہمارا ماضی اور مستقبل، ہماری پرسکون نیند اور وسیع کاروبار، ہماری زندگی اور ہماری موت اسی نوجوان سے وابستہ ہے اس کی زندگی بھی ہمارے لئے حیات افروز۔اوراس کی موت بھی حیات بخش۔

انہی روشن چراغوں سے زمانے میں اجالا ہے
خدا کا اور محمد مصطفیٰ ﷺ کا بول بالا ہے

حضرات باتمکین!

اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ نے شہادت اور شہید کے لفظ کو، اس کے تصور کو، اس کے جذبہ وکردار کو وہ تقدس عطا فرمایا ہے کہ اب ہندو بنیئے بھی اپنے مر کر مٹی میں مل جانے والوں کو شہید کہنے لگے ہیں۔ حالانکہ شہادت کا منصب اوراس کا صلہ صرف اس قوم کا حصہ ہے جو اللہ تعالیٰ اوراس کے رسول ﷺ کے ارشادات کی روشنی میں اس حقیقت کو تسلیم کرتا ہے کہ شہید نہ صرف خود زندہ ہے بلکہ اپنے پیچھے رہ جانے والی نسلوں کو بھی زندگی عطا فرماتا ہے۔

شہید اک مقصد اعلیٰ کی خاطر دے کے قربانی
نوید زندگی لاتے ہیں بہر نوع انسانی

اے ارباب فکر وشعور!

ہمارے آقا محسن انسانیت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ دوزخ کی آگ دو آنکھوں پر حرام ہے۔ایک وہ جورات بھر خوف الٰہی سے لرزہ براندام رہی۔ دوسری وہ آنکھ جورات بھر مورچے میں ملت اسلامیہ اور وطن عزیز کی حفاظت میں جاگتی رہی۔شہید کا خون زمین پر گرنے سے پہلے ہی شرف قبولیت حاصل کر لیتا ہے۔

اس ملک وملت کی خاطر ہی مرنا ہے اور جینا ہے
اس ارض وطن پر کرڈالو نذرانے اپنی جانوں کے

صدر ذی وقار!

شہیدان ملت اسلامیہ ایک مقصد عظیم کی خاطر اپنے سر پر کفن باندھ کر میدان کار زار میں کود پڑتے ہیں۔ وہ دفاعی پوزیشن میں ہوں تو سیسہ پلائی دیوار بن جاتے ہیں۔ حملہ آور ہوں تو نور ایمان کے ہالے میں شعلہ جوالہ بن کر دشمن پر کاری ضرب لگاتے ہیں۔ ان کے سامنے ایک مقصد عظیم، عظمت اسلام ناموس رسالت ﷺ کا اور تقدس ملک وملت کا تحفظ ہوتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لئے وہ جس جس سرحد اور جس جس سرزمین پر اپنے خون کے چھینٹے بکھیرتے جاتے ہیں۔ وہ راہیں اور پگڈنڈیاں اور وہ راستے چمک جاتے ہیں۔ ہم انہی کی شہادت عظمیٰ کے طفیل رات کے مہیب اور تاریک سناٹوں میں میٹھی نیند سوتے ہیں۔ ان کا دشمن کو لکارتے ہوئے آگے بڑھنا۔ جان پر کھیل جانا پھر اپنی ہی لاش سے سرحد کی دیوار کو اونچا کر جانا صرف اس لئے ہوتا ہے کہ ہماری اذان وتکبیر کی آواز کو کائنات کی وسعتوں میں پھیلنے سے کوئی نابکار رکاوٹ نہ بنے چاروں طرف پھیلے ہوئے خدشات اور خطرات کے خوفناک سائے اپنے یقین محکم کی لو سے پاش پاش کر دیتے ہیں۔

شہیدوں کے لہو سے جو زمیں سیراب ہوتی ہے
بڑی زرخیز ہوتی ہے بڑی شاداب ہوتی ہے

صدر محترم وار باب محبت!

وطن عزیز کا ذرہ ذرہ ہمیں اپنی جان سے عزیز تر ہے۔ اس کے کھیت اور کھلیان، اس کی پگڈنڈیاں، اس کے شہر، اس کے قریے، اس کے پہاڑ، اس کی مسجدوں کے مینار ہماری آن ہیں اور ہم اپنی آن کی حفاظت کرنا جانتے ہیں۔

میری آنکھوں کی ٹھنڈک اے میرے حرم
تیرے کھیت اور کھلیان رشک ارم
تیری خوشحالیوں کی تمنا لئے
ظفر چشتی جلائے خوشی کے دیئے

قرآن پاک ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے

صاحب صدر گرامی قدر!

عقل انسانی! پوری کائنات کی دلفریبیوں، انسانیت کے دشمن اول شیطان مردود کی چالوں اور نفس امارہ کی ریشہ دوانیوں کو کماحقہ سمجھنے سے قاصر ہے۔ قدم قدم پر جال بچھے ہوئے ہیں۔ گناہ آلود دنیا ہر لمحہ پھول جھڑی کی مانند مختلف رنگوں میں نظروں کو خیرہ کرتی ہے پھر ہر قریب آنے والے کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ انسان انسانیت سے گر کر حیوانیت کے ذلیل ترین کھڈ میں جا گرتا ہے اور اسے کچھ سوجھتا بھی نہیں پھر یہ کہنا پڑتا ہے کہ۔

شیطان کی اب کوئی ضرورت نہیں یارب
بربادیٔ انساں کو انساں ہی بہت ہے

صدر محترم!

دیکھنے والے حیران رہ جاتے ہیں کہ دیتے ہیں دھوکا بازی گر کھلا، عقل سلیم تڑپ اٹھتی ہے۔ ضمیر انسانی کی چیخیں آسمان کے پردوں کو چاک کرتی ہوئی اپنے رب غفور سے رہنمائی اور ہدایت کی طلب گار ہوتی ہیں۔ رحمت یزداں جوش میں آتی رہی تو گاھے گاھے اس اندھی دنیا میں روشنی کے لئے کسی برگزیدہ بندے کو اپنا پیغام بر بنا کر اور ضابطہ حیات روشن کتاب دے کر بھیجتا رہا ہے۔ یہ سلسلہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت محمد ﷺ کی ذات ستودہ صفات تک جاری رہا۔ جب دنیا میں ظلم و جور، کفر و شرک کی تاریکیاں اس قدر پھیل گئیں اور لاکھوں کروڑوں انسان اس دلدل میں اس طرح گھر گئے کہ وہ اپنے ہی ہاتھوں کے تراشے ہوئے معبودوں کے آگے جھکائے سر اٹھانے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ اخلاقی قدریں مکمل طور پر تباہ ہو چکی تھیں۔ تو اس نے پوری انسانیت کے لئے تا قیام قیامت مکمل ضابطہ حیات ایک نور مبین ایک کتاب مقدس حضرت محمد ﷺ کے ذریعے عطا

فرمائی۔ جس نے زندگی کے تمام شعبوں، عبادت، ریاضت، شجاعت، عدالت، امانت، سخاوت، سعادت، تہذیب وتمدن، بودوباش، خوردونوش، اکل وشرب، قیام وطعام، لین دین، پیارومحبت غرض ہر پہلو پر ایک مکمل ضابطہ حیات دے کر بھیجا اور کوئی پہلو تشنہ نہ چھوڑا۔ حضرات میں آپ کو اس وقت دعوت فکر دیتا ہوں۔ کہ کوئی ایسا شعبہ دکھا دو۔ جس شعبے سے متعلق معلومات کے لئے ہدایت اللہ تعالیٰ کی مقدس کتاب قرآن پاک میں موجود نہ ہو اور اگر آپ کو تسلیم ہے تو میں اپنے دعوے کے حق میں یہ بات بہ بانگ دہل کہتا ہوں کہ

ع قرآن پاک ہی ایک مکمل ضابطہ حیات ہے

دنیا میں قوانین بھی بنتے رہتے ہیں۔ ان میں ترمیم واضافہ بھی ہوتا رہتا ہے وہ قوانین کالعدم بھی ہوتے رہتے ہیں۔ کیوں؟ صرف اس لئے کہ وہ مکمل نہیں ہوتے ہیں۔ وہ وقتی ضروریات اور وقتی تقاضے پورے کرتے ہیں اور اپنے اپنے ملک، اپنے اپنے خاندان اور قبیلوں کی ضروریات اور تقاضوں کو سامنے رکھ کر بنائے جاتے ہیں جب وہ تقاضے پورے ہوتے اسی وقت میں یا ترمیم کی ضرورت پڑ گئی یا اضافے کی۔ یا اسے بالکل ہی ختم کر دیا گیا۔ لیکن قرآن پاک کا ڈیڑھ ہزار سال سے ایک حرف اور ایک لفظ تک نہیں بدلا گیا اور نہ بدلنے کی ضرورت محسوس ہوئی اور نہ تا قیامت محسوس ہو گی۔ کیونکہ یہ ایک ایسا نظام حیات ہے۔ جو ہر دور میں قابل عمل رہا۔ ہر قبیلے کیلئے نافذ العمل ہونے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ ہر سال، ہر صدی کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ بلکہ قرن ہا قرن تک ہزاروں لاکھوں زمانے بدلے۔ قوموں کے تقاضے بدلے۔ خراج بدلے۔ ضرورتیں بدلیں۔ مگر اس کا ایک قانون بھی بدلنے کی ضرورت نہیں۔

حضرات گرامی!

اللہ ایک ہے، روز ازل سے ایک ہے تا ابد ایک رہے گا۔ سچائی ایک حقیقت ہے۔ ازل سے اور ابد تک رہے گی۔ جھوٹ ایک لعنت ہے۔ ازل سے ہے ابد تک رہے گی۔ انسانیت کی قدر ومنزلت ازل سے مسلم ہے ابد تک مسلم رہے گی۔ اور اس طرح انسانیت

سے متعلق ہر شعبہ زندگی کے لازوال اصول ازل سے ہیں ابد تک رہیں گے۔ اور انہی اصولوں کا امین قرآن پاک ہے۔ اس لئے اس میں بیان کردہ ابد تک حقیقت ہی رہیں گے۔ نہ ان میں ترمیم کی ضرورت ہوگی۔ نہ اضافے کی۔ اس مکمل قانون کو لے کر آنے والے حامل وحی الٰہی، مہبط انوار خداوندی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی ذات گرامی بھی اسی طرح تا ابد ایک ہی رہے گی۔ اس کو سمجھنے اس کو پرکھنے اور اس کو حرز جاں بنانے کا جو انداز آپ نے سکھا دیا ابد تک وہی رہے گا۔ اور انہی کی دی ہوئی ٹارچ انہی کی دی ہوئی روشنی سے ہی یہ قرآن پاک کے بعد کوئی کتاب ہی اس کا مقام لے سکتی ہے۔ اور اس کے لانے والے کی جگہ کسی دوسرے کو کھڑا کیا جا سکتا ہے۔ اور حضور ﷺ کی صداقت و نبوت اور لازوال نبوت بھی قرآن پاک کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کی دلیل ہے۔

بدلے گا زمانہ لاکھ مگر
قرآن نہ بدلا جائے گا

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ

تیری یاد ہے یا ہے تیرا تصور
کبھی داغ کو ہم نے تنہا نہ دیکھا

حضرات والا کرم!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے نبی اور رسول جو مردوں کو زندہ کر دیا کرتے تھے۔ سنا ہے کہ 25 دسمبر کو پیدا ہوئے حسن اتفاق دیکھئے کہ اسلامیان ہند کے نامور با جبروت شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات کے ٹھیک 169 سال بعد کراچی کے ایک مسلم گھرانے میں پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کی امت کے ایک فرد ایک ادنیٰ امتی کے گھر ایک بچے کی ولادت بھی 25 دسمبر کو ہوئی جس نے ہندوستان کے مسلمانوں کی مسیحائی کی۔ اس نے ایک سو سال سے ظلم و جبر اور غلامی کی آہنی زنجیروں میں جکڑی ہوئی مسلمان امت کو آزادی کی نعمت سے سرفراز کر کے زندہ قوموں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ اس شخص نے تمام مسلمانوں کے دلوں میں قائداعظم کے نام سے جگہ حاصل کی۔

تحسین و ستائش کی صدا تیرے لئے ہے
کونین کے ہونٹوں پہ دعا تیرے لئے ہے

صدر گرامی!

قائداعظم کا نام محمد علی تھا۔ جسمانی لحاظ سے دبلے پتلے ہونے کی وجہ سے گجراتی زبان میں جینا کے نام سے شہرت پائی کہ گجراتی کاٹھیاواڑی زبان میں اس کے معنے کمزور جسم ہی کے آتے ہیں مگر قدرت کا کرشمہ دیکھئے کہ لفظ جینا بگڑتے بگڑتے کیسا سنورا کہ جناح بن گیا جس کے معنے عربی میں دست و بازو کے ہوتے ہیں۔ اگر لفظ کی معنویت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ جب تک قائداعظم محمد علی جناح نے ہندوستان کے مسلمانوں کی قیادت کا

بیڑا انہیں اٹھایا مسلمان انگریزوں اور ہندوؤں کے مقابل میں بے دست و پائی رہے اور جب اس کمزور جسم کے انسان کے طاقتور بازو قوم کا سہارا بنے تو تاریخ انسانی میں ایک نیا باب رقم کر گئے۔

بنا لیتا ہے موج خون دل سے اک چمن اپنا
وہ پابند قفس جو فطرتاً آزاد ہوتا ہے

حضرات با تمکین!

بلاشبہ قائداعظم ابتداء ہی سے بڑے تھے ان کی عظمت کا راز ان کے عزم صمیم اور مستقل مزاجی میں پنہاں ہے۔ ان کے جوہر اس وقت کھلے جب انہوں نے مشکلات سے دوچار ہو کر اپنی زندگی کا راستہ ہموار کرنے کی ابتداء کی آپ اپنی قانونی قابلیت علمی بصیرت اور ذہانت و فطانت کے جوہر دکھاتے ہوئے جب کبھی اپنے دلائل و براہین کسی عدالت کے سامنے پیش کرتے تو عدالتوں کے منصفین جج صاحبان اور موکلین حتیٰ کہ حریف مدمقابل حضرات بھی نہ صرف قابلیت کے معترف ہو جاتے بلکہ اکثر و بیشتر ان کے سامنے ایسے گوشوں کی نقاب کشائی ہو جاتی جن تک کسی کا تصور بھی نہ پہنچا ہوتا۔

قسم خدا کی محبت نہیں عقیدت ہے
دیار دل میں بڑا احترام ہے تیرا

حضرات محترم!

جس زمانے میں میرے قائد نے مسلمانوں کو انگریزوں سے آزاد کرانے کے لئے سیاست کے میدان میں قدم رکھا ان دنوں گوپال کرشن، دادا بھائی، نوروجی، مولانا محمد علی جوہر اور ابوالکلام آزاد کا ہندوستان میں طوطی بولتا تھا۔ قائد ان دنوں کانگرس کے سرگرم رکن تھے۔ لیکن جب آپ نے دیکھا کانگرس کے ہندوؤں کے ناپاک عزائم مسلمانوں کے جان و مال اور عزت و آبرو کو پامال کرنے والے ہیں تو آپ کی دوراندیشی، معاملہ فہمی اور وسیع النظری نے اس مہیب خطرے کو بھانپ لیا اور مسلم لیگ میں شامل ہو کر ان کے ناپاک عزائم

سے پردہ چاک کیا۔ تو مسلمانوں کی ایسی آنکھیں کھلیں کہ کانگرسی ناخداؤں کو جان کے لالے پڑ گئے۔ اس دن سے کانگرس کے پودے کی جڑیں کھوکھلی ہونا شروع ہوگئیں آخر 46،1945ء کے عام انتخابات کے نتائج نے کانگرس کا وہ پودا جڑ سے اکھاڑ پھینکا جس کا سایہ سارے ہندوستان پر پھیلا ہوا تھا۔ اور 1947ء میں پنجاب، سندھ، بلوچستان، سرحد اور مشرقی پاکستان کے مسلمانوں نے اس کے مضبوط تنوں اور پتوں، ٹہنیوں کو حقارت سے مسل کر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر کے قابل بھی نہ رہنے دیا۔

میں نے فانی ڈوبتے دیکھی ہے نبض کائنات
جب مزاج یار کچھ برہم نظر آیا مجھے

جناب والا!

یہ نہایت پرفتن دور تھا۔ ہندوؤں کے بڑے بڑے شاطر وعیار سیاستدان اور ان کے ہاتھوں میں کھیلنے والے کانگرسی ملا ہندو مسلم اتحاد کے ڈونگرے بجا رہے تھے۔ مسلمانوں کو یک جہتی سے محروم کرنے کے لئے ناپاک سازشوں اور تدبیروں کے جال بچھائے ہوئے تھے انہوں نے مسلمانوں کو رام کرنے کے لئے اپنی شام پراتھنا پر سورہ فاتحہ پڑھانا شروع کر دی اور ادھر چند ناعاقبت اندیش کانگرسی ملاؤں نے دہلی کی جامع مسجد کے مقدس ممبر پر گاندھی اور نہرو جیسی مشرک ونجس مخلوق کو لا کر بٹھا دیا ایسے میں ایک میرے قائداعظم محمد علی جناح تھے جو نہ صرف ان کے دام فریب سے محفوظ رہے بلکہ گاندھی کی سیاست کی اپنی فراست سے دھجیاں تک اڑا کر رکھ دیں۔

حضرات گرامی!

یہ عزم کا کوہ گراں، استقلال کی چٹان، فہم وفراست کا عمیق سمندر اور جرأت وہمت کا پیکر، اپنے ارادوں میں کامیاب ہوا برطانیہ کے فرعونوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ہندوؤں کے ارادہ کو ناکام کیا۔ 1947ء کی ایک حسین صبح کو دنیا کا آٹھواں عجوبہ پاکستان کے نام سے معرض وجود میں آیا، خدا کی شان منزل پر پہنچ کر وہ عظیم انسان اس نقشے میں

رنگ بھرنے میں مصروف تھا۔ کہ 1948ء کی ایک رات وہ چاند ہم سے موت کے آہنی پنجوں نے چھین لیا دنیا نے یہ منظر پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔ کہ آنکھیں جنازہ دیکھ کر اشکبار ہیں۔ اور لبوں پر زندہ باد زندہ باد کے نعرے ہیں۔ دل محبوب قائد کی جدائی میں غم واندوہ کے بوجھ سے بیٹھا جارہا ہے اور زبان زندہ باد زندہ باد کے نعروں میں لذت لے رہی ہے۔

آپ کو پتہ ہے پھر کیا ہوا۔

ہاں پھر۔

سارے جہاں کی دھوپ میرے گھر میں آ گئی
سایہ تھا جس شجر کا میرے سر سے کٹ گیا

قائداعظم ایک عظیم سیاستدان

نہ جانے کتنے رہبر اس دنیا میں ہیں لیکن
زمانہ آج بھی محسوس کرتا ہے کمی ان کی

اے مسند صدارت کی رونق اورارباب بزم!

میرا قائد، قائداعظم ہے۔ جوایک عظیم قائداور راہبر ورہنما کی حیثیت سے برصغیر کے افق پر ابھرا۔ جیسے مشرق سے سورج طلوع ہوتا ہے۔ اور چار دانگ عالم کو منور کرتے ہوئے اپنے وجود کا احساس دلاتا ہے۔ بلکہ ہر اندھے کو بھی خبر ہو جاتی ہے کہ سورج طلوع ہو چکا ہے ایسے ہی سیاست کے افق پر ابھرنے والا قائد بھی ایسا ہی قائد تھا۔ کہ سیاست کے نام پر بازی گری کا کھیل کھیلنے والے اندھوں کو بھی سیاست میں کئی نئے راستے مل گئے۔

حضرات گرامی!

ہندوستان کے خوابیدہ مسلمانوں کی قسمت جاگی اور ایک ایسا راہبر مل گیا جس کی ہر ٹھوکر سے ایک نئی راہ تشکیل ہوتی تھی۔ وہ بظاہر نحیف ونزار، ہڈیوں کا ڈھانچہ، لمبا تڑنگا لیکن عزم وہمت کا کوہ گراں۔ فہم وفراست کی دنیا کا بادشاہ اور سیاست عالم کے لئے ایک زندہ مثال محمد علی جناح۔ کہ جس کے نام پر بھی رب کا سایہ ہے۔ حسن اتفاق دیکھئے کہ لفظ رب کے جتنے عدد ۲۰۲ ہیں اور محمد علی کے نام کے عدد بھی ۲۰۲ ہی ہیں اسی لئے کہا گیا ہے کہ محمد اور علی کے نام پر بھی رب کا سایہ ہے۔

اندوہ میں تسکین کے پہلو نکل آئے — دل خوش ہوا اتنا کہ آنسو نکل آئے
یارب ہو ترا خاص کرم ہم پہ ہمیشہ — رحمت ہو تیری قائداعظم پہ ہمیشہ

حضرات محترم!

اس سیاست کی دنیا کے میرے رہبر ورہنما کو کوئی دیکھے ان کی بے داغ زندگی کا مطالعہ

کرے تو اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں ہوگا۔ کہ جب تک وہ جملہ قائدانہ صلاحیتیں موجود نہ ہوں جو ایک اچھے قائد میں ہونی چاہئیں تو دنیا اسے قائد و راہبر تسلیم کر ہی نہیں سکتی۔ سیاست کے نام پر بازی گری کرنے والا بازی گر تو کہلا سکتا ہے۔ لیکن سیاست دان نہیں ہوسکتا آج کے دور میں ہم سیاست اور سیاست دان کے نام سے بدک سے کیوں جاتے ہیں صرف اس لئے کہ میدان سیاست میں آنے والے نام و نمود کے بھوکے، ایمان و ضمیر کے سودے کرنے والے چند کھوٹے سکوں پر وطن و ملت کو بیچ کھانے والے، کرسی اقتدار کی عروسہ کے چہرے سے نقاب سرکنے کی قیمت میں میر جعفروں کے لبادے اوڑھ لینے والے سامنے آ گئے ہیں۔ اب تو ہر شخص ایسی سیاست کو دیکھ کر چیخ اٹھا ہے۔

کوچہ کوچہ قریہ قریہ میں سیاست بٹ گئی
گویا میرے شہر کے سب لوگ پاگل ہو گئے
ہر کسی کے ہاتھ میں صابر ہے نفرت کی چھری
کوچہ و بازار جیسے سارے مقتل ہو گئے

جناب صدر!

یہی وجہ ہے کہ ملک کی جغرافیائی اور نظریاتی سرحدوں کے پہرے کمزور ہوتے جا رہے ہیں۔ ہر گھر کی چار دیواری ایسے ہی سیاستدانوں کے ہاتھوں ریت کی دیوار بنتی جا رہی ہے۔ لیکن آج بھی اگر اسی قائد کی سیاست کا لبادہ اوڑھ کر پھر کوئی نحیف و نزار، کمزور و ناتواں، لیکن قول کا پکا، عزم کا پختہ، ہمت کا دھنی، ملک و ملت کی سرحدوں کو بنانے والا۔ ہر گھر کی چار دیواری کو سہارا دینے والا، جیب میں کھوٹے سکے رکھ کر بھی سونے چاندی جیسی چمک دکھانے والی پیش کشوں کو پائے حقارت سے ٹھکرا دینے والا کوئی قائد سامنے آئے تو یہ سارے سیاستدان اپنے بستر لپیٹ لیں۔ ان کی چاہتوں کی نیا ڈوبتی ہوئی نظر آئے اور پوری قوم سکھ کی نیند سو جائے کہ ان کا قائد جاگ رہا ہے۔

نہ جانے کتنے رہبر اس دنیا میں ہیں لیکن زمانہ آج بھی محسوس کرتا ہے کمی ان کی

حضرات محترم!

آیئے ہم اپنے قائد کی سیاسی زندگی کا ایک اور زاویہ نگاہ سے مطالعہ کرتے ہیں۔ ایک مخلص کارکن اور بظاہر ہڈیوں کا ڈھانچہ میدان سیاست میں قدم رکھتا ہے۔ تو کئی مگر مچھ آگے بڑھ کر اسے کھانے کو پل پڑتے ہیں۔ لیکن اگر وہ عزم و ہمت کا کوہ گراں بن کر، شجاعت وعدالت کا پیکر بن کر سامنے آ کھڑا ہو تو ان مگرمچھوں کے دانت ایسے کھٹے ہو جاتے ہیں۔ کہ دوبارہ اس کی طرف منہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکتے۔ میرے قائد میں یہ پہلو بھی بہت زیادہ نمایاں نظر آتا ہے۔ میرا قائد بظاہر نحیف و نزار ہے لیکن اس کی جرأت سیاست پہ نظر پڑتی ہے تو نظریں خیرہ رہ جاتی ہیں۔ ان کی جیب کے کھوٹے سکوں سے لے کر برصغیر کی بڑی طاقت تک کوئی ایسا نظر نہیں آتا جو اس قائد سے مخلص ہو خفیہ سازشوں سے قاتلانہ حملوں تک وہ کون سا قدم ہے جو اس کے خلاف نہیں اٹھایا گیا۔ لیکن یہ جسم کا لاغر، جرأت و ہمت کا پیکر بن کر ان تمام طوفانوں، آندھیوں اور بگولوں کے سامنے یوں ڈٹ جاتا ہے۔ جیسے ایک مضبوط تن آور درخت طوفان بادو باراں کے تھپیڑے کھانے کے باوجود اس وقت تک ڈٹا رہتا ہے۔ جب تک طوفان خود تھک ہار کر اپنا منہ موڑ لینے پر مجبور نہیں ہو جاتا۔

اے قائداعظم چمن شوق کے مالی — قدرت نے تجھے دی تھی عجب فطرت عالی
بنیاد گلستاں کی بیاباں میں جو ڈالی — ہر خار کے چہرے سے چمکنے لگی لالی
گردش میں سر بزم جو یوں جام رہے گا — تا حشر زمانے میں تیرا نام رہے گا

صدر ذی شان!

اسلامی جمہوریہ پاکستان کے عظیم قائد نے اپنی سیاست کا آغاز کانگرس میں شرکت سے کیا۔ لیکن ایک دور اندیش اور معاملہ فہم سیاستدان کی حیثیت سے جلد ہی اس نتیجہ پر پہنچ گئے کہ سیاست گری کا یہ مقصد ہرگز نہیں کہ انگریز کی غلامی سے نجات حاصل کر کے ہندو مکار کی جھولی میں جا پڑیں بلکہ ایک مسلمان ہونے کے ناطے آزادی ہند کے نعرے کے ساتھ ساتھ آزادی مسلم کا نعرہ بھی بلند کیا۔ مسلم لیگ کی بنیادوں کو مستحکم کیا اور مسلم عوام میں اس کا

وقار بحال کیا۔ مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آنے کا پیغام گھر گھر پہنچایا حتیٰ کہ پورے برصغیر میں مسلم لیگ مسلمانوں کے دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ یہی دھڑکنیں جب ایک قائد کے دل کی دھڑکن کے ساتھ بن کر دھڑکنے لگیں تو انہیں دھڑکنوں کی صدا 14 اگست 1947ء کی صبح کو پاکستان زندہ باد کی آواز میں گونجنے لگیں۔

چشم روشن پاکستان	دل کی دھڑکن پاکستان
صحرا صحرا اس کی دھوم	گلشن گلشن پاکستان
اپنی ہستی کا حاصل	لے کے رہیں گے پاکستان
اپنا مامن پاکستان	بٹ کے رہے گا ہندوستان

عزیزان محترم!

اب آخر میں قائداعظم محمد علی جناح کی سیاست پر گفتگو کو سمیٹتے ہوئے اس حسرت و چاہت کا اظہار ضروری سمجھتا ہوں کہ جس کا اظہار ایک ہندو رائٹر نے بھی کیا اس نے کہا کہ اگر ہمارے پاس ایک ایسا جناح ہوتا اور مسلمانوں کے پاس ہزاروں گاندھی ہوتے پھر بھی ہندوستان تقسیم نہ ہو سکتا۔

یارب تجھے جمال گل تر کا واسطہ	رعنائی قمر، رخ اختر کا واسطہ
نور چراغ مہر منور کا واسطہ	پروردگار! روح پیمبر کا واسطہ

ان حاکموں کے قلب کو بھر دے خلوص سے
یا پھر ہمارے قائداعظم کو بھیج دے

قیام پاکستان میں قرارداد پاکستان کا کردار

یہ فتنہ و شر کے پروردہ ،تخریب کے ساماں لاکھ کریں
ہم بزم سجانے آئے ہیں ہم بزم سجا کر دم لیں گے
یہ سبز ہلالی پرچم ہے ، ہر حال میں یہ لہرائے گا
یہ نغمہ ہے آزادی کا، دنیا کو سنا کر دم لیں گے

اے مسند صدارت کی رونق اور ارباب فکرونظر!

زیر بحث موضوع میں دو چیزیں سامنے آئی ہیں۔ ایک پاکستان دوسری قرار داد پاکستان۔ کسی چیز کے قیام کے لئے کوئی نہ کوئی تحریک ضرور چلائی جاتی ہے تحریک کسی ایک ایسے لائحہ عمل کو کہتے ہیں جو کسی فرد، گروہ یا قوم کے مفاد اوران کے حقوق کی حفاظت کے لئے چلائی جاتی ہو۔ اس طرح تحریک پاکستان بھی مسلمانان برصغیر کے حقوق کی حفاظت اور ان کے مفاد کے لئے چلائی گئی۔ اب ہم اس طرف آتے ہیں کہ قیام پاکستان کی تحریک میں قرار داد پاکستان نے کیا کردار ادا کیا۔

کسی کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے سب سے پہلے ایک ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ اس ضرورت کے پیش نظر ایک خاکہ تیار کیا جاتا ہے۔ وہی خاکہ آگے چل کر ایک منصوبہ یا ایک نظریہ کی شکل اختیار کر جاتا ہے۔ یہی نظریہ اور خاکہ منصوبے کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ قرار داد پاکستان کی بھی تشکیل و قیام پاکستان میں یہی حیثیت ہے۔

حضرات محترم!

تحریک پاکستان کے آغاز سے پہلے برصغیر میں آزادی کا ایک عام تصور یہ تھا کہ برصغیر کی تمام اقوام، متحدہ طور پر برطانوی حکومت کے طوق غلامی سے آزادی کی کوشش کریں۔

لیکن مسلم لیگ کے قیام سے اور خصوصاً جب قائداعظم محمد علی جناح نے کانگرس کے ممبر ہونے کی حیثیت سے بھانپ لیا کہ ہندو اس آزادی میں مسلمانوں کے لئے مخلص نہیں ہیں تو کانگرس کو چھوڑ کر 1913ء میں مسلم لیگ کی قیادت سنبھالنے سے 1940ء تک کے عرصہ کو ہم قرارداد پاکستان کی تحریک کا حصہ کہہ سکتے ہیں۔ اسی عرصہ میں حضرت علامہ محمد اقبال، مولانا محمد علی جوہر، مولانا حسرت موہانی، خواجہ قمرالدین سیالوی، حضرت علامہ فضل حق خیر آبادی، پیر سید جماعت علی شاہ، علامہ عبدالغفور ہزاروی جیسی عظیم راہنما شخصیتوں نے مسلمانان برصغیر کیلئے ایک علیحدہ قوم، مسلمان کے تصور کو اجاگر کیا۔ ہمارے رہنما ہنود کی ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کے حقوق غصب کرنے والوں کے ارادوں کو بخوبی بھانپ چکے تھے۔ چنانچہ انہوں نے ایک ایسا قدم اٹھانا چاہا جس سے یہ بالکل واضح ہو جائے کہ مسلمانان برصغیر قطعی طور پر ایک الگ ملک کے خواہشمند ہیں۔ جس میں وہ اپنے مذہب، اپنی معاشرت اور تہذیب کے مطابق آزادانہ زندگی بسر کر سکیں۔ 23 مارچ 1940ء سے پہلے یہ شعور قائداعظم محمد علی جناح کی قیادت سے برصغیر میں پیدا ہو چکا تھا جو قرارداد پاکستان کی صورت میں مستقبل میں ایک روشن عزم کی علامت بن گیا۔

گھر کے سارے دیپ بجھا کر اس کا دیپ جلایا ہے　　　ہم نے لاکھوں جانیں گنوا کر پاکستان بنایا ہے

صدر ذیشان!

23 مارچ 1940ء کو لاہور میں منٹو پارک میں منعقد ہونے والے ایک شاندار اور تاریخی اہمیت کے حامل اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی۔ جس میں واضح کیا گیا کہ مسلمانان برصغیر کا ایک علیحدہ ملک پاکستان ہونا چاہئے جو ان علاقوں پر مشتمل ہو جہاں مسلمان اکثریت سے آباد ہیں۔ اسی قرارداد کو قرارداد پاکستان کا نام دیا گیا۔ پھر مسلمانان برصغیر نے اس قرارداد کو سامنے رکھتے ہوئے دوقومی نظریہ کے خطوط پر ایک منظم جدوجہد شروع کر دی۔ یہی قرارداد 1946ء میں مسلم لیگ کی شاندار انتخابی جیت کا باعث بنی۔ یہی قرارداد ایک خاص منزل کا روپ دھار گئی۔ اس منزل تک پہنچنے کیلئے لاکھوں مسلمان بے

گھر ہوئے۔ ہزاروں ماؤں کی گود اپنے بچوں سے محروم ہوئی۔ عورتوں سے سہاگ چھین لئے گئے۔ لاکھوں مسلمان بے دردی سے شہید کر دیئے گئے۔ خون کی ندیاں عبور کرنا پڑیں۔ عورتوں سے ان کے معصوم بچے چھین کر نیزے کی انیوں پر اچھالے گئے اور پھر پاکستان زندہ باد کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کیا گیا۔ آج ہم ان نیزے کی انیوں پر بلند ہو کر پرچم اسلام اور پرچم پاکستان بننے والوں کو، ان کی ماؤں کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں۔

عمر گلوں کی دو دن، جس میں یہ بھی قیامت بیت گئی
دست ہوس نے نوچے لاکھوں، شاخوں پہ مرجھائے کم

وہ پھول سا بچہ اپنی ماں کے مقدس خواب قرارداد پاکستان کی منزل، پاکستان کی فضا میں سکھ کا سانس نہ لے سکا مگر ہم اس کی عظمت، اس شہادت اور اس کی ماں کے حوصلے کو جس نے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لعل کو نیزے کی نوک پر تڑپتے دیکھا۔ خراج محبت پیش کرتے ہیں کیونکہ قرارداد پاکستان کے لئے اس ایک بچے کی قربانی کی وجہ سے آج سینکڑوں بچے اس ملک پاکستان کی فضا میں سکھ کا سانس لے رہے ہیں۔

ہم نے گلشن کو یوں بچایا ہے　　　برق پر آشیاں گرایا ہے

حضرات والا کرم!

قرارداد پاکستان کی منظوری کے بعد مسلمانان برصغیر کا تحریک آزادی کے لئے ایک الگ تشخص قائم ہوا اور مسلمانوں کے دشمنوں کے جذبہ کی وجہ سے یہ بالکل واضح ہو گیا کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ مخلوط نہیں رہ سکتے بلکہ ایک الگ آزاد مسلم مملکت پاکستان کے خواہشمند ہیں۔ یہی قائداعظم محمد علی جناح کی دور اندیشی تھی کہ انہوں نے برصغیر کے مسلمانوں کو قرارداد پاکستان کی صورت میں ایک نعرہ، ایک اعلان اور ایک رستہ دیا۔ وہی نعرہ، وہی اعلان اور وہی راستہ آج ایک عظیم الشان مملکت پاکستان کی صورت میں ہمارے سامنے ہے اور ہم یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ اس کی بنیاد اور اس کی تکمیل کے پس منظر میں قرارداد پاکستان کا ہی حصہ ہے۔

کسی سے نہیں اتنی الفت ہمیں　　　ہے جتنی وطن سے محبت ہمیں

مسئلہ کشمیر عالمی ضمیر کی آزمائش ہے (۱)

صدر ذی احتشام اور حاضرین کرام!

آزادی ہر فرد اور قوم کا پیدائشی حق ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں آزادی کو ودیعت کر دیا ہے۔ یہ غلامی کے طوق و سلاسل میں محبوس نہیں رہ سکتا۔ یہ انسان سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والا مریخ پر کمندیں ڈالنے والا ہے۔ مہر و ماہ کی گزرگاہوں پر سفر کرنے کی صلاحیتوں کا حامل ہے اور ان ودیعتوں کے عملی اظہار کے لئے ایک آزاد اور پرسکون ماحول درکار ہے۔ اس لئے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کو جبر و استبداد کی زنجیروں میں جکڑ ڈالے۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں، بحر بے کراں ہے زندگی

حضرات گرامی!

مسلمانان برصغیر پر نوے سال تک انگریزوں نے غلامی کی سیاہ رات کے سائے زبردستی منڈلائے رکھے۔ آخر کار ایک دانائے راز کے نغمہ ہائے خواب شکن اور بیدار قیادت نے قفس کی تمام تیلیاں ایک ایک کر کے توڑ ڈالیں اور غلامی کی زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔ اسیری کی سیاہ رات سے خورشید رستگاری طلوع ہوا۔ لیکن ایک بدنصیب خطہ ایسا بھی تھا جو آفتاب آزادی کی روشن اور تابندہ کرنوں سے محروم رہا وہ خطہ جسے اہل نظر بہشت بر روئے زمین است اور ایران صغیر کہا کرتے ہیں۔ اس خطہ کشمیر کی آزادی میں روڑے اس لئے اٹکائے گئے کہ پاکستان کے سرسبز و شاداب میدانوں کی شہ رگ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس کے فلک بوس کہسار اور اس کی برفیلی وادیاں اپنی آغوش میں پورے موسم سرما میں محض اس لئے اندوختہ جمع کرتی رہتی ہیں کہ پنجاب و سندھ کے جھلستے میدانوں کی پیاس بجھا سکیں بھلا

مکار حیلہ ساز اور کینہ پرور دشمن یہ کب برداشت کر سکتا ہے کہ خطہ پاک کو ہریالی اور شادابی نصیب ہو۔

دشمن کے دست ظلم سے شمشیر چھین لیں
آؤ کہ بڑھ کر وادی کشمیر چھین لیں

صدر ذی احترام!

اقوام عالم کے نقشے پر ایک نظر دوڑائیے تو بہت سی قوموں پر جنگ اور غلامی کی افتاد پڑی اور وہ غلامی کی زنجیروں کو توڑنے کے لئے سینہ سپر ہوئے اقوام عالم نے ان کا ساتھ دیا اور آخر کار انہیں جبر و استبداد اور غلامی سے نجات مل گئی۔ ویت نام، کمبوڈیا وغیرہ کی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ افغانستان کا مسئلہ بھی اپنے منطقی نتیجے پر پہنچ چکا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ کشمیر جنت نظیر کی سرزمین نے کون سا جرم کیا ہے کہ اس کا باسی آج تک پابند سلاسل ہے۔ اس کی چیخ و پکار اور آہ و بکا، ضمیر انسانیت سے کیوں معذور ہے۔ وہ عالمی ضمیر جو کتوں کی تڑپتی کیفیت دیکھ کر تڑپ تڑپ جاتا ہے۔ اسے انسانوں کے معصوم بچوں کے حلقوم کٹتے دیکھ کر دکھ کیوں نہیں ہوتا۔ دنیا میں امن و امان کے ٹھیکیداروں نے چند بے مقصد اور بے جان قرار دادوں کے سوا کیا کیا ہے۔؟

سمندر سے ملے پیاسے کو شبنم
بخیلی ہے یہ رزاقی نہیں ہے

ہم ضمیر عالم سے سوال کرتے ہیں کہ کویت پر عراقی حملے سے فوراً ہمدردی کا مروڑ تمہارے پیٹ میں کیسے پیدا ہوا۔ فلسطین و کشمیر میں رہنے والوں کا خون کویتیوں کے خون سے کم سرخ ہے؟ اے دنیا کی سپر پاورو! دراصل نہ تمہیں عراق سے دشمنی ہے، نہ کویت سے ہمدردی، نہ حجاز مقدس سے پیار ہے، نہ افغانیوں سے الفت و محبت بلکہ تم صرف حرص و آز کے بندے ہو۔ جہاں تمہیں اپنا مفاد نظر آتا ہے وہاں تعاون، ہمدردی اور امداد جیسے الفاظ استعمال کر کے آگے بڑھتے ہو۔ مکر و فریب کے دوہرے خول چڑھا کر اس دنیا کو بے وقوف

بناتے ہو لیکن سنو! اب کشمیر جاگ اٹھا ہے۔ اب کے اس نے اس انداز سے کروٹ لی ہے کہ ہندو بنیئے کو دھوتی سنبھالتے بنے گی۔

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

حضرات محترم!

اب آخر میں اپنے گریباں میں منہ ڈالتے ہیں۔ ہم نے بھی مسئلہ کشمیر اور اپنی شہ رگ کے کٹنے کا احساس نہیں کیا۔ اس مسئلہ کو مفادات کی بھینٹ چڑھایا، مصلحتوں کے خول چڑھائے، بڑے بڑے شملوں کے معاہدوں کی تہوں میں چھپایا۔ دنیا کے ضمیر کو کیا پڑی کہ مدعی سست اور گواہ چست ہو جائے۔ جب تک بچہ نہ روئے اس وقت تک تو اس کی حقیقی ماں کے سینے میں دودھ کے دھارے بھی جوش نہیں مارتے تو دنیا ہمارے مسئلے کے لئے بیدار کیوں ہو اگر ضمیر عالم کو بیدار کرنا ہے، اگر کشمیر جنت نظیر کو آزاد کرانا ہے، اگر اس کے مجاہدوں کو آزاد فضاؤں کی مہکتی سانسیں مہیا کرنی ہیں تو مصلحتوں اور مفادات کے خول سے نکل کر شعلہ جوالہ بن کر میدان میں کود پڑو، کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے تو ایک بازو کٹوا چکے ہیں اب کوئی شہ رگ بھی نہ کاٹ کر لے جائے۔

میری مانو چلو منجدھار میں موجوں سے ٹکرائیں
وگرنہ دیکھنا ساحل پہ سارے ڈوب جائیں گے

مسئلہ کشمیر عالمی ضمیر کی آزمائش ہے (۲)

اُمڈے سیلاب کہ طوفان، قیامت توڑے
اس پہ لعنت، جو منہ راہ طلب سے موڑے
ہم اولوالعزم ہیں پیچھے نہیں ہٹنے والے
اور ہوں گے کوئی رستے سے پلٹنے والے

صدر ذیشان اور ارباب فکر وشعور!

قفس کی تیلیاں کتنی ہی حسین کیوں نہ ہوں، جلاد کا کوڑا کتنا ہی مرصع کیوں نہ ہو، تلوار کی چمک، آنکھوں کو کتنا ہی خیرہ کرتی ہو۔ پھر بھی قفس، قفس ہے۔ جلاد، جلاد ہے۔ اور تلوار، تلوار ہے۔ صیاد کی میٹھی بولیاں کبھی قید ہونے پر آمادہ نہیں کرسکتیں۔ جلاد کے چہرے کی مسکراہٹ کسی کو اپنے جسم و جاں کے رشتہ کو منقطع کرانے پر آمادہ نہیں کرسکتی۔ اس لئے کہ آزادی کا ایک سانس غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ بلکہ ہزار بار بہتر ہے۔ تنفس کی ڈوری کا یہ سلسلہ ہر متنفس بہر حال قائم رکھنا چاہتا ہے۔

عشق پر قربان میری زندگی
لیکن آزادی پہ میرا عشق بھی قربان ہے

براعظم ایشیا و افریقہ میں کئی شاطر صیادوں نے اپنی شاطرانہ چالوں اور ہوس ملک گیری میں خوبصورت جال پھیلائے مفتوحہ، مقبوضہ علاقوں میں معاشی و معاشرتی وسائل کی ملمع سازی کا خول چڑھایا، نگاہوں کو خیرہ کر دینے والی پھل جھڑی کی چکا چوند رکھنے والی پالیسیاں نافذ کیں لیکن ان کی غلامی کو خوشی سے سینے سے لگانے پر کوئی آمادہ نہ ہوا کوئی ذی ہوش اس فلفل سیاہ کو مصری کی ڈلی نہ کہہ سکا اور یہ زہر ہلاہل کبھی قند نہ بن سکی۔

اس کشتی حیات کے لنگر کو توڑ دو — ہو جس کا رخ، ہوائے غلامی پہ گامزن

اے ارباب فکر ونظر!

لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ آزادی کے متوالے جہاں جہاں بھی اپنی آزادی کی داستانیں رقم کرتے رہے اپنی قبا پر اپنے خون کے چھینٹوں سے لالہ زار چمن آباد کرتے رہے۔ وہاں وہاں ان مسافران آزادی کو مسافر نواز ملتے رہے۔ ان کی ہمتوں اور جرأتوں کو جلا بخشنے کے لئے لوگ آگے بڑھتے رہے ان کے حوصلوں کو ماحول کی سازگاری سے لے کر آتشیں اسلحہ کی بیساکھیوں تک سب کچھ مہیا کرتے رہے اور وہ ہر قدم پر گرتے گرتے سنبھلتے رہے اور سنبھل سنبھل کر ابھرتے رہے۔ لیکن کشمیر کی حسین وادی اور اس کے باسیوں کو بھارت کے عفریت کے شکنجے نے جب سے جکڑ رکھا ہے۔ تب سے اب تک ظلم و بربریت کے پنجے اور اس کے زہریلے ناخن اور گہرے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس سے نجات حاصل کرنے والے کشمیری مجاہدین کو خوش آمدید کہنے والے کہاں سو گئے ہیں ویت نام اور اتھوپیا کی تڑپتی انسانیت کی چیخوں پر تڑپ اٹھنے والے آج خواب خرگوش کے مزے کیوں لے رہے ہیں۔ کیا ان کے زخموں پر مرہم رکھنے کے لئے چند بے جان قرار دادیں ہی کافی ہیں۔ دنیا میں امن وامان برقرار رکھنے کے ٹھیکیدارو! ان مجاہدوں کو دو میٹھے بول بول کر سہارا دینے والے کیوں خاموش ہیں؟

مجھے تو گردش حالات پہ رونا آیا — رونے والے تجھے کس بات پہ رونا آیا

کتنے انجان ہیں کس سادگی سے پوچھتے ہیں — کیا میری کسی بات پہ رونا آیا

اے میرے محسنو! اور ارباب بزم!

ہے سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری دور حاضر کے یہ سارے بے تاج بادشاہان کی سلطانی بھی عیاری و مکاری سے عبارت ہے یہ امداد و تعاون کا ہاتھ صرف وہاں بڑھاتے ہیں۔ ان کا ضمیر صرف وہاں جاگتا ہے جہاں ان کے اپنے مفادات موجود ہوں۔ یہ مسلمانوں کے ازلی دشمن ہیں ان کا ضمیر نہ کشمیر کے لئے جاگے گا اور نہ فلسطین کے لئے۔

افغانستان کے جیالے مجاہد خون میں نہا رہے ہیں ان کے مردہ ضمیر میں کبھی انگڑائی پیدا نہیں ہوئی۔ میرے جسم کا ایک حصہ مشرقی پاکستان کٹ گیا لیکن امریکی بیڑا ابھی تک نہیں پہنچا۔ اس لئے کہ یہ لوگ ضمیر نام کی کسی چیز سے واقف ہی نہیں۔ جہاں سود و زیاں اور نفع و نقصان کی بنیاد پر محبت کی پینگیں بڑھائی جاتی ہیں وہاں ضمیر زندہ نہیں رہ سکتا۔

ہمیں ہے ان سے وفا کی امید　　جو جانتے ہی نہیں وفا کیا ہے

صدر ذی شان!

آزادی ہر فرد و قوم کا پیدائشی حق ہے اللہ رب العزت نے انسان کی فطرت میں آزادی کو ودیعت کر رکھا ہے۔ یہ غلامی کے طوق و سلاسل میں محبوس نہیں رہ سکتا یہ انسان سورج کی شعاعوں کو گرفتار کرنے والا اور مریخ پر کمندیں ڈالنے والا ہے۔ مہر و ماہ کی گزرگاہوں پر سفر کرنے کی صلاحیتوں کا حامل ہے۔ اور ان ودیعتوں کے عملی اظہار کیلئے آزاد اور پر سکون ماحول درکار ہے۔ اس لئے کسی انسان کو کوئی حق نہیں کہ وہ دوسروں کو زنجیروں میں جکڑ ڈالے کہ۔

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

اے صدر ذی وقار اور حاضرین محترم!

میں آخر میں عرض کرنا چاہوں گا وہ چھوٹا سا پتھر جو خود اپنے قدم جما نہیں سکتا وہ ہمیشہ راہ گیروں کی ٹھوکروں میں رہتا ہے اور ادھر ادھر لڑھکتا رہتا ہے اور جو پتھر چٹان بن کر جم جاتا ہے طوفان باد مخالف کے تھپیڑے سہنے کی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ وقار، شان اور عظمت صرف اسی کو زیب دیتی ہے اور وہی دنیا کی توجہ کا مرکز بنتا ہے۔ اس لئے کسی بے ضمیر اور مردہ ضمیر کو اس کی بے ضمیری کا طعنہ نہ دیں بلکہ اپنا بوجھ خود اٹھانے کی ہمت پیدا کریں۔ اپنا قرض ہندوستان سے خود وصول کریں اپنی شہ رگ بچانے کے لئے اپنا زور بازو آزمائیں۔

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلا دیں گے　　چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر

کب تک کسی سے وعدہ فردا کریں گے ہم | اپنے ہی اعتماد کو رسوا کریں گے ہم
کب تک یہ جنگ دور سے دیکھا کریں گے ہم | کل ہم پہ آنچ آئی تو پھر کیا کریں گے ہم

صدر گرامی قدر!

درخت کی زیبائش و زینت شاخوں اور پتوں سے ہے۔ ان کے بغیر وہ ٹنڈ منڈ کس کام کا۔ بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ اس کی بقا بھی انہی سے وابستہ ہے۔ بعینہٖ افراد کے مجموعے کا دوسرا نام قوم ہے۔ افراد کے بغیر قوم کا کوئی تصور نہیں اس سے یہ مطلب اخذ کیا جا سکتا ہے کہ افراد ہی قوم کی تقدیر کے مالک ہیں۔ ان افراد میں ہی ایسے جز شامل ہیں۔ جنہوں نے جسم کے مختلف اعضاء کی طرح قوم کو سنبھالا ہوا ہے۔ کوئی موچی ہو یا لوہار، کسان ہو یا مزدور، استاد ہو یا طالب علم، ڈرائیور ہو یا کنڈیکٹر، ہر شخص نے اپنے وجود سے قوم کو سہارا دیا ہوا ہے۔ پارچہ باف کپڑا بننا چھوڑ دے۔ پوری قوم گھروں میں شرم سے منہ چھپاتی پھرے، پاپوش بنانے والا جوتی کی صنعت سے کنارہ کش ہو جائے تو راستے کے کانٹوں کا سر کیسے کچلا جائے گا۔ منصف مسند انصاف کو چھوڑ دیں تو جرائم کی دنیا میں موسمی مینڈکوں کی طرح نہ جانے کتنے ناسور جنم لے لیں گے۔ درس و تدریس کے میدانوں میں سکولوں اور کالجوں میں رعنائیاں اگر استاد سے وابستہ ہیں تو طالب علم بھی اسی کا رنگ و روغن ہیں۔ اگر ایک ایک طالب علم کھسکنا شروع کر دے تو کالجوں اور یونیورسٹیوں کی ہر دیوار پر الوؤں کا راج ہوگا۔ لہلہاتے کھیت، سرسبز باغات، راتوں کے تاریک سناٹے توڑنے والے ملہاروں کے گیت، دیہاتوں کے کنوؤں پر پانی بھرنے والی پنہاریوں کی اٹھکیلیاں، سڑکوں پر بوجھ اٹھانے اور پتھروں کے سر کچلنے والے مزدور سب مل کر ایک قوم بنتے ہیں۔

برادران ذی شان!

جس طرح افراد کے بغیر قوم کا کوئی تصور نہیں اسی طرح کوئی شخص بذات خود اپنی حیثیت علیحدہ منوانا چاہے اور ہمچو ما دیگرے نیست کا راگ الاپنا چاہے تو ہر دوسرا شخص اس سے پوچھ سکتا ہے بے وقوف تم تو اپنے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا بھی تیار نہیں کر سکتے۔ اگر تم خود گندم کاشت کر بھی لو، پیدا بھی کر لو، چکی کون بنائے گا، چکی کے اوزار کون بنائے گا۔ اگر یہ بھی ہو جائے تو چولہا کا مسئلہ آ جائے گا تو اکون بنائے گا؟ ایندھن کون تیار کرے گا؟ لکڑیاں کیسے کاٹو گے؟ دیا سلائی کیسے بناؤ گے؟ الغرض ایک فرد اپنی علیحدہ حیثیت میں زندگی کا ایک سانس لینے سے معذور ہے گویا قوم اور افراد دونوں لازم وملزوم ہیں۔ اقوام کی تقدیر افراد کے ہاتھوں میں افراد کی تقدیر اقوام کے ہاتھوں میں ہے۔

جناب مکرم!

باقی رہا مسئلہ تقدیر کا تو تقدیر اچھی بھی ہو سکتی ہے۔ بری بھی، بری تقدیر کا ذکر تو لا حاصل اچھی تقدیر قوم کے افراد کے ہاتھوں میں ہے۔ جس درخت کے پتے سرسبز، خوبصورت، ہرے بھرے، جاذب نظر اور اس کے پھل پھول کارآمد ہوں گے، ایسا درخت اپنی حیثیت کا لوہا منوالیتا ہے ایک کور مغز انسان بھی ایسے درخت کی اہمیت سے انکار نہیں کر سکتا۔ ایسے اگر اقوام کے افراد صاف ستھرے، محنتی، جفاکش، تعلیم یافتہ، باایمان، دیانت دار، انصاف جو، انصاف پسند، بااخلاق اور اخلاق کے جملہ پہلوؤں کے صحیح آئینہ دار ہوں گے تو قوم کا سر فخر سے تن جائے گا۔ بلکہ اغیار کا سر اسی قوم کے سامنے جھک جائے گا۔ دشمن کی صفوں میں اس کی دھاک بیٹھ جائے گی بلکہ کاتب تقدیر اپنا قلم اسی قوم کے ہاتھ میں دے دیتا ہے۔ پھر وہ اپنی تقدیر کے فیصلے خود اپنے ہاتھوں رقم کرتی ہے۔ چاردانگ عالم میں جس سمت چاہتے ہیں اپنا پھریرا اڑاتے پھرتے ہیں اور اگر قوم کے افراد کا مجموعی تو ام کام چور، کاہل ست اور ظلم و جبر، راشی سود خور اور احساس کمتری کا شکار ہو گا۔ تو پھر کہا جا سکتا ہے۔

فطرت افراد سے اغماض تو کر لیتی ہے ۔۔۔ کبھی کرتی نہیں ملت کے گناہوں کو معاف

بچوں کے اخلاق بگاڑنے کا ذمہ دار معاشرہ ہے (۱)

متاع کارواں لٹنے کا کس کافر کو صدمہ ہے
ستم ہے لوٹنے والوں میں تیرا نام آیا ہے

چمن کی ہر کلی جو کبھی ہر قوت شامہ کے مالک کے مشام جاں کو معطر کیا کرتی تھی۔ بہار جانفزا کا ہر وہ پھول جو کبھی گلے کا ہار ہوا کرتا تھا۔ پھولوں کی وہ کیاریاں جنہیں دیکھ کر دل میں گدگدی پیدا ہو جایا کرتی تھی۔ نہ جانے کیا ہوا۔ اب کے بہار آئی تو کیسی۔ کہ اب میرے ملک کی ہر ننھی کلی مشام جاں کو معطر نہیں مغلظ کرتی ہے۔ پھول گلے کا ہار نہیں۔ میری شکست اور ہار پر مسکراتے ہیں پھولوں کی کیاریاں دلوں کو گداز نہیں بلکہ اضطراب بخشتی ہیں۔ سوچتا ہوں کلیاں تو وہی ہیں۔ ان کے چٹکنے کے انداز بھی وہی ہیں گلوں کے چہروں سے معصومیت بھی اسی طرح چھلکتی ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ اب کے بہار ہی کی فضا مکدر ہو گئی ہے۔

ع اس بار میرے دل میں ہے غم اور طرح کا

حاضرین با تمکین!

میرے پاک وطن کے معاشرے کی فضا یقیناً مکدر ہے۔ اس فضا کے ہر ذرے میں ناپاک اور گندے جراثیموں نے اپنے غلیظ پنجے اس طرح گاڑھ لئے ہیں کہ پورے چمن کو متاثر کر گئی ہے۔ یہ بچے، یہ پھول، یہ کلیاں اس بہار سے متاثر ہو کر جب چٹکتی ہیں تو پاس بیٹھے ہوئے کو بھی گھن آنے لگتی ہے۔

جب گھر کا ایک ذمہ دار فرد اپنے بچے سے کہتا ہے کہ جاؤ بیٹے باہر کال بیل (Call Bell) دینے والے صاحب سے کہہ دو کہ ابا جان گھر پر نہیں ہیں، تو ننھا سا ذہن سوچ کے گہرے سمندر میں ڈوب جاتا ہے کہ میرے جھوٹ کے خلاف اور سچ کے حق میں دھواں دار تقریر کرنے والے ابا جان کی تقریر کے الفاظ تو ابھی فضا میں جذب بھی نہیں ہوئے۔ لیکن یہ

کیا ؟ بس یہی انداز اخلاق اور تضاد بیانی اس کے اخلاق بگاڑنے کا آغاز کرتی ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ میرے گھر کے ہر فرد نے جسم پر دوہرا لباس زیب تن کیا ہوا ہے بچہ ذرا شعور کی آنکھ کھولتا ہے تو اس کے ڈیڈی اس کو سکول داخل کرانے کی سوچتے ہیں۔ لیکن سکول جاتے ہوئے بس سٹاپ پر کھڑے کھڑے گھنٹوں گزر جاتے ہیں جب بس آتی ہے تو یہ نونہال مسکرا اٹھتا ہے۔ لیکن جب اسے دس پیسے یا چار آنے کا بوجھ سمجھ کر بس شاں سے گزر جاتی ہے تو مستقبل میں قوم وملت کی باگ ڈور سنبھالنے والے کا دل تڑپ کے رہ جاتا ہے اور سراپا احتجاج بن جاتا ہے۔ کبھی وہ بس پر پتھر مارتا ہے اور کبھی مغلظات سے نوازتا ہے اور وہ ہم سے سوال کرتا ہے۔ بتایئے مجھے گالیاں دینے اور سراپا احتجاج بننے پر کس نے مجبور کیا۔ کیا اس کا ذمہ دار معاشرہ نہیں ہے۔

جناب صدر والا قدر!

میں جب پیدا ہوا تو دین فطرت پر پیدا ہوا تھا۔ سرکار دو جہاں خواجہ ارض وسما حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کے ارشاد کی روشنی میں مجھے عیسائی یا مجوسی میرے ماں باپ کی تربیت نے بنایا ہے۔ پ حضرات اور پورے معاشرے کا ہر فرد اپنے ضمیر میں جھانک کر دیکھے کیا میں گالی، ہرزہ سرائی، بیہودہ پن آوارہ گردی، ہیرا پھیری، گانے بجانے کی صفات ماں کے پیٹ سے لے کر آیا ہوں۔ میری تو پیدا ہوتے ہی اس ماحول کو دیکھ کر چیخیں نکل گئی تھیں۔ کہ اے پروردگار! تو مجھے کہاں لے آیا۔ جہاں سلطانی بھی عیاری ہے درویشی بھی عیاری۔ اس وقت سے لے کر آج تک۔

کتنے ہی انقلاب شکن در شکن ملے
خود اپنی شکل دیکھ کے میں دنگ رہ گیا

اے مسند صدارت کی رونق!

میرا ننھا سا دل اور ناپختہ ذہن بھی محسوس کرتا ہے کہ

بڑھ گئے ہیں اس قدر قلب ونظر کے فاصلے

کہ ڈھونڈنے نکلو تو اب اپنا ہی گھر ملتا نہیں

معلوم ہوتا ہے معاشرے کا ہر فرد اپنی قوم کے بچوں کے اخلاق بگاڑنے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔قوم کے شعراء اور ادباء سے لیکر ہر ماجھے ساجھے، ریڑھی لگانے والے تک۔قوم کے لیڈر سے لیکر تانگابان تک۔وکلاء سے لیکر جہاں تک ہر شخص اپنا اپنا کردار ادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رہا۔مخرب اخلاق فلمیں ہیجان انگیز گانے، جذباتی ڈائیلاگ، دشمن صحت ملاوٹیں، کربناک دوہرے خول، حیرت انگیز ہیرا پھیریاں، تباہ کن ریڈیو اور ٹی وی کے پروگرام، حیران کن محسنوں کے کردار اور بزرگوں میں خوئے دلنوازی کی کمی، غرض ہر وہ بات جس کا بچوں کے اخلاق بگاڑنے سے تھوڑا سا بھی تعلق ہے معاشرہ اپنی بھرپور ذمہ داری اور ایمانداری کے ساتھ ادا کر رہا ہے۔جیسے میرے شہر کے سب لوگ پاگل ہو گئے۔

اے رونق محفل صدر گرامی!

میں اس ایوان کے عندیہ کی بھرپور تائید کرتا ہوں کہ یقیناً بچوں کے اخلاق بگاڑنے کی پوری ذمہ داری معاشرہ پر ہے۔

اے خدا اب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے

تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

بچوں کے اخلاق بگاڑنے کا ذمہ دار معاشرہ نہیں ہے (۲)

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حضرات محترم!

مجھ سے پیشتر ایک صاحب اس جوانی کے عالم ہی میں بزرگی کا لبادہ اوڑھ کر اپنے اور اپنے ہم جولیوں کی بداخلاقی کی ذمہ داریوں کا بوجھ اپنے بزرگوں کے سر تھوپ رہے تھے۔ واہ! سبحان اللہ یہ لوگ دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھنے سے پہلے اپنی آنکھ کا شہتیر کیوں نہیں دیکھتے۔

صدر گرامی قدر!

فرقان حمید کلام الٰہی ہے۔ ہدایت کا سرچشمہ ہے۔ مشعل راہ ہے۔ لیکن اس کے متعلق خود قرآن گواہ ہے۔ کہ

يُضِلُّ اللّٰهُ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ (مدثر:31)

جس کا جی چاہتا ہے اس سے ہدایت حاصل کر لیتا ہے اور جس کا جی چاہتا ہے۔ وہ اس سے گمراہ ہو جاتا ہے۔ بتایئے نعوذ باللہ! اس میں قرآن پاک کا کیا قصور ہے؟ قصور تو آپ کے مزاج کا ہے جب آپ کوے کو سفید کرنے پر تلے ہوئے ہیں تو کوئی مائی کا لعل بھی آپ کو اس کے کالے رنگ پر رضامند نہیں کر سکتا۔

جناب مکرم!

مجھے قائد ایوان سے سخت اختلاف ہے معاشرے کو ہدف تنقید بنانا ایک فیشن بن گیا ہے۔ جس کو دیکھو معاشرہ پر زبان طعن دراز کر رہا ہے۔ بسوں میں، تانگوں میں، دکانوں پر، سکولوں، کالجوں میں عدالت و مساجد میں، زندگی کے ہر شعبے کا ہر فرد معاشرے کو کوس رہا

ہے۔معاشرہ بگڑ گیا ہے۔معاشرے نے یہ کردیا ہے۔وہ کردیا ہے۔اگر معاشرہ ہی ہر چیز کا ذمہ دار ہے۔تو بتایئے زندگی میں سب سے پہلے قتل کرنے والے انسان نے دوسرے انسان کے خون بہانے کا سبق کہاں سے سیکھا تھا۔اس کو اتنی خبر بھی نہ تھی کہ اب اسے ٹھکانے کیسے لگائے وہ تو اللہ بھلا کرے کوے کا جس نے بتایا کہ بھئی اگر جرم کر ہی لیا ہے۔تو اس کو چھپانے کے لئے میری طرح مٹی کھودو اور اس میں دفن کردو۔اور اگر میرے دوستوں اور معاشرے پر تنقید کرنے والوں کی معاشرہ سے مراد ''کوا'' ہی ہے۔تو سبحان اللہ ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔کوس لیجئے جتنا مرضی۔ مجھے اس سے کوئی خیر خواہی نہیں یہ موا بچپن میں میرے ہاتھ سے بھی روٹی کا ٹکڑا چھین کر لے جایا کرتا تھا۔

دے گیا جو دل میں چبھ کر، درد کی لذت ہمیں
درد سے نا آشنا اس خار کی باتیں کریں

اور اگر اس سے مراد یہ نہیں بلکہ انسانی تہذیب و تمدن ہے۔تو بتایئے۔مرچوں میں اینٹیں پیس پیس کر ملانے والے کا معاشرے پر تنقید کرنے کا کیا حق ہے۔دفتری اوقات میں کنٹری سن سن کر اور چائے نوشی میں سارا وقت صرف کر کے اوور ٹائم زیادہ سے زیادہ بنانے والا بھی معاشرے کو مورد الزام ٹھہراتا ہے۔تو کیوں۔ وہ کیوں کہتا ہے کہ میرے بچوں کے اخلاق کا معاشرے نے دیوالیہ نکال دیا ہے۔کنڈیکٹر بچوں سے پیسے وصول کرتا ہے اور ٹکٹ نہیں دیتا بچے احتجاج کرتے ہیں۔تو کنڈیکٹر خود ہی دھواں دھار تقریر شروع کر دیتا ہے۔ اوئے تم کس اسکول میں پڑھتے ہو تمہیں کسی نے بولنے کی تمیز نہیں سکھائی کیا چھولے دے کر پڑھے ہو وغیرہ وغیرہ پھر ساتھ ہی مسافروں سے مخاطب ہو کر کہتا ہے کہ دیکھو جی معاشرہ کس قدر بگڑ گیا ہے۔

عزیزان محترم!

میرا سوال پھر وہی ہے کہ معاشرے سے کیا مراد ہے۔نہ تو اینٹیں پیس کر مرچوں میں ملانے والا، نہ دودھ میں پانی ملانے والا، نہ رشوت لینے والے کلرک بادشاہ اور نہ استاد،

کیوں کہ وہ تو خود بھی غلط کام کرتے ہیں اور معاشرے پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ صاف ظاہر ہے کہ معاشرہ کسی تیسری چیز کا نام ہے، جو معلوم کرنا ابھی باقی ہے۔

عالی جاہ!

میں تو اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ معاشرہ میری اپنی ہی ذات کا دوسرا نام ہے۔ ہمیں سنوارنے میں ہمارے بزرگوں، اساتذہ، اسلاف کا، اولیاء اللہ کا، صوفیاء کرام، وانبیاء کرام علیہم السلام کا یقیناً ہاتھ ہے۔ لیکن بگڑنے کا میں خود ذمہ دار ہوں، بجلی اس دور کی مفید ترین ایجاد ہے میں اس کے ننگے تار کو ہاتھ لگا کر موت کو دعوت دوں تو نادانی میری ہے۔ تار کا اس میں کیا قصور؟ گھی مقوی اغذیہ میں شامل ہے۔ لیکن اس کے استعمال سے پہلے میں اپنے معدے کو ٹھیک نہیں کرتا اور گھی کی مضرت پر الٹا گھی کو موردِ الزام ٹھہراتا ہوں تو بتایئے پاگل خانے جانے والی ویگن پر پھر گھی کا ڈبہ تو نہیں رکھا جائے گا۔

حضرات گرامی!

آیئے ہم سب مل کر قائد ایوان کو مشورہ دیتے ہیں کہ اپنے ضمیر کو جھنجھوڑو۔ اپنا الزام دوسروں کے سر تھوپنے کی بجائے جرات سے کام لیں اور اعتراف کر لیں کہ ہم اور ہمارے بچوں کو بگاڑنے کا ذمہ دار معاشرہ نہیں بلکہ اس کے ذمہ دار ہم خود ہیں۔

شاید اسی کا نام محبت ہے شیفتہ
ہے آگ سی جو سینے کے اندر لگی ہوئی

بچوں کے اخلاق بگاڑنے کا ذمہ دار معاشرہ ہے (۳)

اے صدر گرامی عظمت کی نشانی!

یہ معاشرہ جدید ایجادوں سے آراستہ و پیراستہ، جدید فیشن کا دلدادہ، نام نہاد جمہوریت کا پروردہ، غریبوں کا حامی، امیروں کا دوست، سینما کا شوقین، ٹیلی وژن کی پیداوار، رموز خودی سے ناواقف، عشق مجازی کا شکار، مولوی کا دشمن، کلب کا طرف دار معاشرہ ہی یقیناً بچوں کے اخلاق بگاڑنے کا بھرپور ذمہ دار ہے۔

آج کل کی روشنی نے کر دکھائے کام دو
گھر کو روشن کر دیا دل میں اندھیرا کر دیا

زمانے نے اس قدر ترقی کی ہے کہ ایک ناممکن کام پل بھر میں ممکن بنا دیا۔ ایندھن کی جگہ کوئلہ، کوئلہ سے پٹرول، پٹرول سے بجلی اور اب بٹن دبائیں اور گھر بھر کو بقعۂ نور بنالیں۔ ان ہی ایجادات کے باعث اب چندا ماموں دور کے نہیں رہے۔ لیکن دوسری طرف معاشرے نے اپنے بچوں کے اذہان کو ان ایجادات کی تعلیم دینے کے ساتھ ساتھ اخلاقی تربیت کے اہم ترین کام کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا
اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

حاضرین محفل!

اب ہمارے سامنے یہ مسئلہ ہے۔ کہ کیا واقعی بچوں کے اخلاق بگاڑنے کا ذمہ دار معاشرہ ہے اور اگر ہے تو کیسے؟ اس سوال پر مثبت جواب دیتے ہوئے دوسرے سوال کا جواب روزمرہ کی زندگی کے سانچے میں ڈھلی ہوئی اخلاقی اقدار سے ظاہر ہے ہم دیکھتے ہیں کہ اگر کوئی بزرگ آج کے کسی تعلیم یافتہ نوجوان کو کسی قبیح حرکت پر ٹوکتے ہیں تو وہ ان کو یوں

جھڑک دیتا ہے۔ کہ وہ بزرگ اسے پھر موت کے منہ میں لے جانے والی شرارت سے بھی نہ روکیں گے۔ آخر وہ کونسی بات ہے جس کی وجہ سے اس بچے نے بزرگ کو ناراض کر دیا وہ اسکی اخلاق باختگی ہے۔ شرم وحیاء کا فقدان ہے۔ ادب واحترام کے تقدس واہمیت سے ناآشنائی ہے۔

حضرات گرامی!

ماں کی گود سب سے پہلا مدرسہ ہے۔ جہاں سے اسے تربیت ملنا تھی۔ اسی گود کی ٹھنڈک نے اسے تربیت یافتہ بنانا تھا۔ اب یہ گود بچوں کو گود میں لینے کو بوجھ تصور کرتی ہے۔ اور آیا کے سپرد کر کے دفتروں، بازاروں اور انارکلیوں میں گھومتی پھرتی ہے۔ جو اس معصوم کو ماں کی ممتا نے تربیت دینا تھی وہ آیا کے ہاں سے کیسے میسر آ سکتی ہے؟ دوسری تربیت گاہ اس کا سکول اور مدرسہ تھا اب وہ بھی تربیت گاہ کی بجائے عقوبت خانہ بنا ہوا ہے۔ استاد کی مشفقانہ باتیں اسے نصیب نہیں ہوتیں۔ بلکہ ہدیہ دل وصول کرنے والے ہدیہ بل وصول کرتے ہیں۔ روحانیات سے محروم استاد، جب سے مادیات کے خنجر سے گھائل ہو چکا ہے۔ وہ مربی نہیں رہا بلکہ کچھ اور ہی ہو گیا ہے۔ اس لئے بچوں کے لئے یہ تربیت گاہ بھی ویران ہو چکی ہے۔ وہ تعلیم تو تھوڑی بہت حاصل کر لیتا ہے۔ تربیت حاصل نہیں کر سکتا۔ اسی لئے غیر تربیت یافتہ پڑھے لکھوں کی محفل میں بیٹھنے کے تجربات بالکل انوکھے نظر آتے ہیں۔

پڑھے لکھوں کی محفل میں ہوا یہ تجربہ ہم کو
کہ اہل دستخط سے تو انگوٹھا چھاپ اچھے ہیں

صدر محترم اور حاضرین گرامی!

زمانہ بھی بہترین استاد ہے۔ یہی زمانہ ہمارا معاشرہ ہے۔ اگر یہ معاشرہ صحیح نہج پر گامزن ہے۔ تو سبحان اللہ۔ میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں کہ بچوں کے بگاڑنے کا ذمہ دار معاشرہ ہے اور اگر ایسا نہیں تو پھر میرے مخالف اس حقیقت سے چشم پوشی کیوں کر رہے ہیں؟ اور خواہ مخواہ بچوں کی دشمنی مول لیتے ہوئے مجرموں کی پشت پناہی کر رہے ہیں۔

معاشرہ مجرم ہے اس مجرم کو درست کر لیجئے۔ کہ کل کے بچے میرے اور آپ کے معاشرے کی بہترین تصویر ہوں گے پھر کوئی بزرگ ان کو اخلاق باختگی کا طعنہ نہ دے سکے گا۔

راہزنوں سے آج تک نہ ہو سکا
جو ہمارے راہنما کرتے رہے

عمل کے بغیر علم بے کار ہے (۱)

اقبال بڑا اپدیشک ہے، من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا غازی بن تو گیا، کردار کا غازی بن نہ سکا

صدر گرامی قدر اور ارباب محفل!

علم و عمل فطرتاً لازم و ملزوم ہیں۔ عمل جہالت پر مبنی نہیں ہو سکتا۔ بے علم عمل پاگل پن ہے۔ دیوانگی ہے۔ علم ہو اور عمل نہ ہو جناب مکرم یقین نہیں آتا۔ معرفت اور آگہی ہو۔ لیکن جرأت و ہمت کردار نہ ہو۔ اتنا اندھیرا یا تو علم علم نہیں یا صاحب علم، علم کا اہل ہی نہیں۔ جوہر تو جوہر ہوتا ہے۔ سر کا تاج شہنشاہ کو زیب دے رہا ہو۔ یا گدھے کے گلے کا ہار ہو۔ البتہ ظرف بدل جانے سے اس کی قدر و منزلت میں فرق ضرور پڑ جاتا ہے۔ تاج میں تو اس کی چمک دیدنی ہوتی ہے۔ اس کی آب و تاب نظروں کو خیرہ کرتی ہے۔ دلنواز و دلربا ہوتی ہے۔ اور اگر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پڑا ہو تو اپنی بے قدری کی وجہ سے اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔
علم بھی ایک جوہر ہے۔ کسی اہل کے پاس ہو تو علم اپنی آب و تاب دکھاتا ہے۔ صاحب علم کے رنگ میں، ڈھنگ میں، چال میں، ڈھال میں، ایک وقار ایک اعتماد اور ایک سنجیدگی پیدا کرتا ہے۔ لوگ اسے دیکھتے ہیں اور رشک کرتے ہیں۔ خود نہ سہی اپنے بچوں کو اس جیسا بنانے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ محفلوں میں تذکرے، مساجد میں سجدے، کلیساؤں میں گھنٹیاں، سڑکوں پر نظم و ضبط، عمارتوں میں رفعتیں، رفعتوں میں عظمتیں اور خاموش خلاؤں میں ہل چل یہ سب کچھ کیا ہے کیوں ہے اور کیسے ہے۔ یہ سب کچھ ایک صاحب علم کے عمل کا پرتو ہے۔ اس کی سیرت ہے اس کا کردار ہے۔ اس کے علم کی ضیا بیزیاں ہیں، رنگینیاں ہیں اور اگر علم اتفاقاً کسی نااہل کے ہاتھ میں آ جائے تو اسے ہم عالم نہیں کہہ سکتے۔ گدھے پر کتابوں کا بوجھ لاد دیا جائے تو کیا گدھا عالم ہو جائے گا۔ نہیں۔

جناب مکرم!

وہ گدھا ہی رہے گا۔کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز

کتنا طوطے کو پڑھایا پھر بھی حیواں ہی رہا

تو عالی جاہ! ہم اس نتیجہ پر پہنچے کہ علم و عمل لازم وملزوم ہیں علم بغیر عمل کچھ نہیں جیسے عمل بغیر علم کچھ نہیں۔

حضرات باتمکین!

گلاب کا پودا اگر پھول نہیں دیتا تو کانٹے دار جھاڑی ہے۔گلاب نہیں ہے۔بس اور گاڑی اگر سواری کے قابل نہیں تو بے کار چھکڑا ہے۔اسی طرح اگر علم کے ساتھ عمل نہیں تو بے کار ہے۔گدھا ہے۔حیوان ہے۔

رہبر انس وجاں، راز دار کن فکاں، واقف اسرار لامکاں حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ایک روز اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے جھرمٹ میں تشریف فرما تھے آپ ﷺ نے فرمایا۔قیامت اس وقت آئے گی جب علم اٹھ جائے گا صحابہ رضوان اللہ علیہم نے عرض کیا۔آقا یہ کیسے ہوگا؟ ہم نے علم حاصل کیا ہم اپنے بچوں کو پڑھائیں گے۔ہمارے بچے اپنے بچوں کو پڑھائیں گے۔علم کیسے اٹھ جائے گا۔آپ ﷺ نے فرمایا۔تمہاری ماں تمہیں روئے۔میں سمجھتا تھا کہ تم سمجھدار ہو گے۔نزول قرآن سے پہلے کیا توریت، زبور، انجیل، جیسی مقدس کتابیں موجود نہ تھیں۔وہ تو موجود تھیں البتہ ان پر سے عمل اٹھ گیا تھا۔گویا کتابیں ہی صفحہ ذہن سے محو ہو گئیں۔اسی طرح کتابوں، لائبریریوں، سکولوں اور کالجوں کی شکل میں اگر علم ہو اور عمل نہ ہو تو سمجھ لو علم ہی اٹھ گیا۔گویا علم کے ساتھ عمل نہ ہو تو ایسے میں تو قیامت ہی آتی ہے۔

آثار قیامت کے نمودار ہیں ماہر

ایسے میں تو کافر کو بھی آتا ہے خدا یاد

اے زیب کرسی صدارت!

آخر میں میں اپنے مستقبل کے ارادوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے آپ سے تعاون کی بھیک مانگتا ہوں۔ آیئے کتابوں کا بوجھ اٹھانے والے گدھوں کو اس بوجھ سے نجات دلا دیں۔ آیئے یہ ہیرا گدھے کے ہار سے نوچ لیں اور مستقبل کے کسی شہنشاہ کے تاج میں سجادیں۔ آیئے ان کانٹے دار جھاڑیوں کو اکھاڑ پھینکیں اور گلاب کے نئے پودے لگائیں تاکہ پھول کھلیں اور ارباب ذوق کے مشام جاں معطر ہوں۔ میری قوم کو، میرے ملک کو بے عمل عالموں کی کانٹے دار جھاڑیوں کی ضرورت نہیں ہے۔

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

عمل کے بغیر علم بے کار ہے (۲)

حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

اے مسند صدارت کی رونق اور اے محفل دانشوراں!

علم نور ہے، روشنی ہے، تابندگی ہے، چراغ اندھے کے ہاتھ میں آ جائے تو بھی فائدہ دیتا ہے۔ دوسرے رہروان منزل کے لئے راستے کی تاریکیاں چھٹ جاتی ہیں اور ان کی راہیں منور ہو جاتی ہیں اور نابینا بھی دوسروں سے ٹکر کھانے سے بچ جاتا ہے۔ کس قدر خوش نصیب ہے وہ شخص۔ جو بینا بھی ہو اور صاحب چراغ بھی۔ خود بھی گمراہ نہیں ہوتا۔ دوسروں کے لئے بھی روشنی کا مینار بن جاتا ہے۔ ایسا شخص زندگی کا ہر موڑ بے خطر کاٹ سکتا ہے۔ جنگلوں کی گھنی چھاؤں کی تاریکیاں بے نور پھیلتے سائے۔ گھنگھور گھٹاؤں کی سایہ بیزیاں اندھی راتوں کے خوفناک سناٹے، اس کی منزل میں رکاوٹ نہیں بنتے اور کس قدر بد نصیب ہے وہ شخص جو بینا بھی ہو اور چراغ بھی رکھتا ہو لیکن ٹھوکریں اس کا مقدر ہوں۔ وہ صاحب علم و بصیرت بھی ہو۔ واقف راہ حیات بھی ہو، دولت روشنی سے تونگر بھی۔ صاحب تاج رہبری بھی ہو۔ لیکن اپاہج بھی اور گونگا بھی۔ اندھا بھی اور بہرا بھی۔ گمراہی منزل اس کا نصیب ہو، زندگی بے نور، محفلیں بے رونق، گفتگو بے سلیقہ، قدموں میں ڈگمگاہٹ، ہر آہٹ پہ خوف، نہ جانیں کیا کیا بلائیں اس کے گھر بن بلائے مہمان ہونگی۔ وائے افسوس! وہ ذات جو روشنی علم کے باوجود راہ عمل پر چلنے سے قاصر ہے۔

صدر ذی وقار!

خاکم بدہن یہ بد نصیبی، یہ محرومی، یہ حرماں نصیبی، میری قوم کا مجموعی قوام بن چکی ہے۔

دراصل ہمیں اس نور پر یقین نہیں رہا۔ ہم اس گومگو کا شکار ہیں کہ شاید یہ روشنی ہمیں کہاں لے جائے۔ غلامی سے ہے بدتر بے یقینی۔ ہم صاحب علم ضرور ہیں لیکن بے عمل بھی۔ ہم صاحب چراغ بھی ہیں لیکن اپاہج بھی۔ ہم صاحب بصارت بھی ہیں لیکن ناواقف راہ بھی۔

یہ پھول کھلے ہیں کہ میرے زخم کھلے ہیں
گلشن میں جدھر دیکھئے مقتل کی فضا ہے
دیکھنا یہ حبس کا عالم رہا تو ایک دن
اک بگولا آئے گا سب کچھ بہا لے جائیگا

اے ارباب فکر ونظر!

علم کے ساتھ بے عملی ہو۔ تو ازل سے تا امروز منافقت کہلائی ہے۔ اسلام کے دور اول کے وہ منافقین جن کے تذکرے ہماری کتاب مقدس میں بکثرت پائے جاتے ہیں۔ ان کا علم عین الیقین کی رفعتوں پر فائز تھا۔ قرآن گواہ ہے کہ وہ

يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ (بقرہ:146)

لیکن وہ اس نور سے مستنیر نہ ہو سکے۔ لعنتوں کے طوق، پھٹکاروں کی پھوار اور نفرتوں کی بدبو اپنی زندگیوں میں یوں بکھیر گئے کہ پورے معاشرے کے جسم میں ان کے ذکر سے آج بھی جھرجھری آنے لگتی ہے۔

وہ اندھیروں میں سفر کرتے تھے اس امید پر
منزل مقصود تک دل کا دیا لے جائے گا

اے فضاؤں کی بسیط وسعتو!

اے نیل گوں آسمان کی رفعتو! اور اے چمکتے ستاروں کی روشن کرنو! تم نے ان بے عمل دانشوروں کا حال دیکھا ہوگا اگر یاد ہے تو دور حاضر کے نام نہاد بے یقین و بے عمل دانشوروں کو بتاتے کیوں نہیں کہ اے لوگو ذرا ٹھہرو۔ سنو سنو۔ عمل کے بغیر علم بے کار ہے اور علم بغیر عقیدے کے بے کار ہے۔

اور

گر یہی عالم تیرے طرز تغافل کا رہا
کوئی تجھ کو ایک دن تجھ سے چرا لے جائیگا
مدعی رہ جائیں گے فریاد کرتے قتل پر
اور قاتل مسکراتا خوں بہا لے جائیگا

اے دور حاضر کی عظیم شخصیتو!

اور مستقبل کی امیدوں کے سہارے نوجوانو! خدائے قدوس و برتر نے ہر اس شخص کو مخاطب کیا ہے جو اپدیشک لوگ علم و فضل کا سرمایہ رکھنے کے باوجود گفتار کے غازی تو ہیں لیکن کردار کے غازی نہیں۔

اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ وَاَنْتُمْ تَتْلُوْنَ الْكِتٰبَ

''کیا تم لوگوں کو تلقین و نصیحت کرتے ہو اور خود کو اللہ تعالیٰ کی کتاب پڑھتے پڑھتے بھول جاتے ہو''۔ (بقرہ:44)

لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۝ (صف)

جو کچھ تم خود نہیں کرتے۔ دوسروں کو اس کا حکم کیوں دیتے ہو؟ گویا علم رکھتے ہوئے عمل سے بے نیاز شخص اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں بھی معتوب ہے اور معاشرے میں بھی منفور و ناپسندیدہ۔

راہ صحرا تو دکھا دی اس نے اہل شوق کو
اور خود بیٹھا رہا محفل میں فرزانہ بنا

صدر ذی وقار!

اگر اجازت ہو تو آخر میں دور حاضر کا تجزیہ بھی کرتا چلوں۔ قیام پاکستان سے پہلے مسلمانوں کی تعلیم کا تناسب بہت ہی کم تھا۔لیکن ایماں سے عمل کی راہ پر ایسے گامزن تھے کہ پاکستان جیسی ایک عظیم مملکت بنا کر دنیا کی نظروں کو خیرہ کر دیا۔اور آج گلی گلی۔ کوچہ کوچہ،

قریہ قریہ، دانش گاہیں، سکول، کالجز، اکیڈمیز اور انسٹی ٹیوشنز کھلے ہوئے ہیں۔ تعلیمی تناسب 1947ء کی نسبت آج بہت زیادہ ہے۔ لیکن دوستو! بتاؤ ایسے سونے کو کیا کروں جو میرے کانوں کو پھاڑ کھائے۔ ایسا علم کس کام کا جس کو پڑھ کر منافقت و مکاریاں اس مقدس ملک کے وجود کی دھجیاں اڑانے لگیں۔ تعلیم عام ہے۔ ترقی سے نفرت ہے۔ عمارتیں تعمیر ہو رہی ہیں اور بنیادیں کھوکھلی کی جا رہی ہیں۔ بچوں کو بوسے دیئے جا رہے ہیں لیکن بڑا ہونے سے پہلے ہی گلا گھونٹا جا رہا ہے۔

اے خدا جو بھی مجھے پند شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو میرے زخم کی گہرائی دے
تیرے لوگوں سے گلہ ہے میرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا تو بینائی دے

تعلیمی انحطاط کے ذمہ دار اساتذہ ہیں (۹)

متاع کارواں لٹنے کا کس کافر کو صدمہ ہے
ستم ہے لوٹنے والوں میں تیرا نام آیا ہے

اے صدر گرامی قدر اور ارباب محبت!

آپ نے میرے لئے ایسے حالات پیدا کر دیئے ہیں۔ کہ جائے ماندن نہ پائے رفتن ۔ایک طرف عظمت استاد کو جھک کر سلام کرتا ہوں تو دوسری طرف حرف شکائت بھی ہے۔ اگر زندگی دوام کی غلامی کا نذرانہ پیش کرتا ہوں۔ تو اپنے محسنوں کو آئینہ بھی دکھا رہا ہوں عجب طرفہ تماشا ہے سوچتا ہوں کہیں ایسا نہ ہو جائے۔ کہیں ویسا نہ ہو جائے تاہم الامر فوق الادب کے پیش نظر مشکل ہے. بہت کام مگر کر کے رہوں گا۔

حضرات محترم!

میں نے اس موضوع پر گفتگو کرنے سے پہلے اپنی زندگی کے تمام ہم سفروں سے پوچھا کہ بتاؤ استاد کون ہے۔ تو کہنے لگے پہلے ماں، پھر زمانہ، پھر معلمین مکتب و مدرسہ۔ میں نے غور کیا کہ کہیں تعلیمی انحطاط کی ذمہ دار میری ماں ہی نہ ہو۔ تو ایک بزرگ نے کہا پڑھے لکھے باپ کی اولاد جاہل رہ سکتی ہے۔ لیکن پڑھی لکھی ماں کی اولاد جاہل نہیں رہ سکتی تو مجھے یاد آیا۔ کہ میری قوم کی ماں تو ابھی جاہل ہے۔ جاہل، تعلیم کیا جانے۔ ڈوبنے والا دوسروں کا سہارا کیسے بنے گا۔ غافل، غفلت سے نہیں نکل سکتا اور جو ماں کچھ پڑھی لکھی ہے۔ وہ جاہل سے بھی بدتر ہے۔ الا ماشاء اللہ اسے میک اپ کرنے، فیشن پرستی، ٹی پارٹیوں، دفتروں اور کلبوں کی مصروفیات اور سویٹروں کے نت نئے ڈیزائن تیار کرنے سے ہی فرصت نہیں ملتی یعنی۔

اسے فرصت ہی نہیں دیتے افکار معیشت کے

حضرات با وقار!

زمانہ بھی بہترین استاد ہے۔ لیکن اہل زمانہ اس کے بھی استاد نکلے۔ بلکہ وہ تو چال قیامت کی چل گئے۔ جب اہل زمانہ کی شعبدہ بازیاں رنگ لائیں تو پتہ چلا کہ یہ زمانہ اور اہل زمانہ اور یہ ماحول جس میں میں نے شعور کی آنکھ کھولی ہے۔ اگر یہ استاد ہے تو یقیناً یہ بھی تعلیمی انحطاط کا ذمہ دار ضرور ہے۔

عالی جاہ!

جب باڑ ہی کھیت کو کھانے لگے جب کعبے میں ہی صنم پرستی شروع ہو جائے جب محافظ ہی اپنی محفوظہ کو محفوظ کرنے لگیں تو کیا کھیت کے مالک کی چیخیں نہ نکلیں گی۔ رب کعبہ جلال میں نہ آئے گا۔ ایسے محفوظہ کے مالک کے کرب کا اندازہ کون لگا سکے گا۔ بس اس چیخ، اس جلال اور اسی کرب کو محسوس کر کے جسارت اظہار لے کر آیا ہوں۔

بشر بے چین ہو تو انقلاب آیا ہی کرتا ہے
گلوں کے داغ دھونے کو سحاب آیا ہی کرتا ہے

اے حاضرین با تمکین!

تیسرے نمبر پر معلمین مکتب و مدرسہ تو بہر صورت ہی استاد ہیں اور بحث طلب موضوع میں شائد یہی اساتذہ کرام اہم عنصر ہیں۔ یقین کیجئے تدریس ایک بہت ہی مقدس پیشہ ہے اور عظیم فریضہ بھی لیکن مجھے افسوس ہے کہ آج کے اس دور میں اس راہ پر چلنے والوں نے اپنے پیشہ سے انصاف نہیں کیا حالات حاضرہ کی چکا چوند نے ان کی نظروں کو خیرہ کر دیا ہے۔ یہ سادگی کے پیکر، محبت کا سرچشمہ، یہ عظمت کی نشانی، یہ خوئے دل نوازی کے مظہر، ماں کی ممتا سے بڑھ کر حسین، باپ کی شفقت سے زیادہ شفیق اور قیادت کا صحیح معیار بالکل ہی بدل گیا ہے۔ یہ جدید فیشنوں کو نقد دل کا نذرانہ پیش کرنے لگے۔ ان کی محبت تجارت بن گئی۔ ان کی عظمت ایک افسانہ بن گئی۔ ان کی خوئے دلنوازی میں جاں سوزی کا پیغام۔ ہائے اس ماں کی ممتا سے بچے ڈرنے لگے۔ جن کی قیادت ہر ٹھوکر سے ایک نئی راہ پیدا کرتی

تھی۔خود آپ ہر قدم پر ٹھوکریں کھانے لگے۔

یہ تذکرے ہیں تمہارے عزیز داروں میں
کہ اجڑ گیا ہے بھرا گھر بھری بہاروں میں

اے مسند نشین صدارت اور حضرات با تمکین!

آپ کو یہ باور کرنا ہوگا کہ آج کے اساتذہ کرام کا اپنے موضوع پر مکمل عبور نہ ہونا۔ اپنے پیشہ سے مطمئن نہ ہونا اور ان کے قول وفعل کا تضاد ہی تعلیمی انحطاط کا باعث ہے۔ایک بار میری حیرت اور استعجاب پر میرے ایک استادگرامی نے اپنے فارغ البال سر کو میرے سامنے رکھتے ہوئے کہا کہ دیکھ تجھے پڑھانے کے صلہ میں میری قوم نے مجھے یہ دیا ہے۔دور ایک جھونپڑے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا میں اس بوسیدہ مکان کا باسی ہوں اور وہ دیر تک میرے خوبصورت لباس سے اپنے لباس کا موازنہ کرتے رہے جب وہ گھر جانے لگے تو میں بھی ساتھ ہولیا۔ راہ میں میں نے عظمت انسانیت کو ان کے سامنے جھکتے ہوئے دیکھا۔ بڑے بڑے کروفر والوں کو استقبال کرتے ہوئے دیکھا۔آنکھیں فرش راہ ہوتے ہوئے دیکھیں۔نقد دل کے نذرانے دیکھے۔میں نے دیکھا کہ فلک بوس عمارتیں جھک کر سلام کرتی ہیں۔عظیم شاہراہیں میرے استاد کے سامنے بچھی بچھی جاتی ہیں۔لیکن جب میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو حیرت سے میری آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں کہ وہ تو ابھی تک میرے جھوٹی شان وشوکت والے لباس ہی کو دیکھے جارہے تھے۔

سوچ تو دل میں لقب ساقی کا ہے زیبا تجھ کو
انجمن پیاسی ہے اور پیمانہ ہے بے صہبا تیرا

عالیجاہ!

بچے کا ذہن ایک صاف ستھری دھلی ہوئی سفید چادر کا نام ہے۔اس پر جو نقوش ثبت کیے جائیں گے ان کا مٹانا مشکل ہے۔ جب بچہ دیکھتا ہے۔کہ میرا باپ، میرا استاد میرے ہدیہ دل پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ مجھ سے زبردستی بل بھی وصول کرتا ہے اور بچے کے سامنے

جب ان افعال کا مرتکب ہوتا ہے۔ جو بچے میں دیکھے تو برداشت نہ کر سکے تو بچے کا ذہن سوالیہ نشان بن جاتا ہے صداقت کی جگہ جھوٹ ، دعاؤں کی جگہ گالیاں ،قوم کا غم پینے کی بجائے تمباکونوشی ۔اسلاف کی قدامت سے جدید فیشن کا رسیہ پن ،ایک نقال طالب علم کے لئے شتر بے مہار بننے کے لئے کافی ہے۔

رہزنوں سے آج تک نہ ہو سکا
جو ہمارے راہنما کرتے رہے

آخر میں اساتذہ کرام سے درخواست کرتا ہوں کہ یہ گفتگو آپ حضرات کو آئینہ دکھانے کے لئے ہرگز نہیں تھی۔ بلکہ میرا مقصود میرے سامنے امیر المومنین سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا قول مبارک تھا آپ نے فرمایا: میرا جی چاہتا ہے کہ میں اس شخص کا منہ چوم لوں جو میرے عیب میرے پاس تحفہ کے طور پر لے کر آتا ہے۔اور اب درخواست گزار ہوں۔

لے جا کے ہم سفر کو جو منزلوں پر لوٹیں
ان راہزنوں میں تیرا کہیں نام آ نہ جائے

تعلیمی انحطاط کے ذمہ دار طلباء ہیں (۲)

صدر ذیشان، منصفین باوقار اور حاضرین باتمکین!

انسانی زندگی کی گاڑی جب بھی کبھی مشکلات کا شکار ہوئی ہے قوم کی نیا کے کھیون ہاروں نے اس نیا کو موجوں کے تلاطم سے نکالنے کے لئے جب بھی کبھی اپنے دائیں بائیں دیکھا ہے۔ طلبہ نے اپنے بزرگوں کو کبھی مایوس نہیں کیا۔ طوفان بادو باراں ہو یا عیار دشمن کے غیض وغضب کی گھٹائیں، امن وآشتی کی بہار ہو یا بے چینی و بدامنی کی خزاں، تحریک آزادی ہو یا تحریک پاکستان، تحریک ختم نبوت ہو یا تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ ہر دور میں جب کوئی مشکل مقام آیا۔

اپنے دامن کو کیا خون سے تر پھولوں نے
اک میرا دامن کانٹوں سے چھڑانے کے لئے

لیکن جب ایک ماں نے دیکھا کہ میرا ہونہار، میرا منا، میرا لاڈلا جس کی لوریوں میں میں نے مادر وطن کے گیت گائے ہیں جس کے گالوں میں میرے لبوں کے لمس نے صبح آزادی کی ٹھنڈک بھری ہے۔ جس کو میری ممتا نے زیور تعلیم سے آراستہ کرنے کے لئے صبح کے ناشتے سے لے کر پہننے کے لئے خوبصورت لباس، کتابوں کے لئے خوبصورت سابستہ، آنے جانے کے لئے سائیکل، تانگہ، ویگن، بسوں، کاروں کا انتظام کیا ہے۔ یہ ان تمام سہولتوں کے باوجود امتحان میں فیل کیوں ہوگیا ہے۔

اسی طرح پھر ایک استاد نے محسوس کیا کہ وہ پیارا بیٹا میرا شاگرد رشید، میرا تلمیذ انیس جسے میں نے زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی جس کی خاطر اپنا سکون و آرام تج کیا جس کو میں نے اپنے دل کے راز بتائے۔ وہ امتحان میں ناکام کیوں ہوا۔

ادھر حکومت وقت نے دیکھا کہ وہ طالب علم جس کی خدمت میں حکومت کی ساری

مشینری سرگرم عمل ہے۔ معاشی ،معاشرتی ،ثقافتی اور صنعتی امور سے بڑھ کر جس کے لئے بجٹ منظور کیا جاتا ہے لاکھوں پرائمری اور ہائی سکول اور کالجوں کی عمارات ان کی تزئین ان میں اساتذہ کا تقرر۔ پھر ان اساتذہ کرام کے روزینے ،شعبہ ٹیکسٹ بک بورڈ ، شعبہ امتحانات ، شعبہ ترقی اردو ادب۔غرض بے شمار محکمے جس کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ناکامیاں اس کا مقدر کیوں ہوگئی ہیں۔ بلکہ اب تو یہ حالت ہوگئی ہے۔کہ آپ بھی میں بھی اور پوری قوم کا ہر فرد سوالیہ نشان بنا ہوا ہے کہ اے

برق بن کر میرے خرمن کو جلانے والے
تو تو برساتھا کبھی ابر بہاراں کی طرح

صدر گرامی!

یہ طالب علم یہ علم کی منزل کا مسافر نہ جانے کس طرف کو چل دیا ہے۔اس کا ہر قدم بے راہ روی کی طرف ،اس کے ہر تصور میں عیاشی ،آوارہ گردی میں خوش ،جلوسوں ہڑتالوں میں پیش پیش ،ہرزہ سرائی یا وہ گوئی اور دشنام طرازی اس کا شیوہ ،اپنی آنکھ کا شہتیر دیکھے بغیر دوسروں کی آنکھ کا تنکا دیکھ کر کیچڑ اچھالنا اس کا مشغلہ ،تعلیم سے فرار ،فلموں سے پیار ،کیا زمانے میں اس کے پنپنے کی یہی باتیں ہیں۔کیا تعلیم پروان چڑھانے کے یہی انداز ہیں۔ اگر دیکھنے والے کی آنکھ دور اندیش ہے۔اگر اس کا دل حساس ہے تو اس ہونہار کو دیکھ کر پکار اٹھے گا کہ اگر طالب علم اس شریف ہستی کا نام ہے تو یقیناً تعلیمی انحطاط کی ذمہ داری بھی اس پر عائد ہوتی ہے۔

حضرات محترم!

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ تعلیمی انحطاط کا ذمہ دار معاشرہ ہے۔ میں عرض کرتا ہوں کہ زبردست طوفان باد و باراں میں جو درخت سینہ سپر ہو کر اپنا وجود برقرار رکھتے ہیں ان کی موجودگی میں کم ظرف و کم ہمت گر جانے والے کی مثال کی آخر کیا حاجت ہے جبکہ تصویر کا ایک رخ یہ ہے۔کہ ماں باپ اس سے نالاں ،اساتذہ کا گستاخ ،شرفاء زمانہ اس سے شاکی ،

حکومت وقت کے لئے یہ وبال جان، اسلاف کے لئے باعث ننگ، سکول و کالجز اور یونیورسٹیاں اس سے مایوس۔ اس کے امتحانی پرچے اس کے حافظے کی تختی کی طرح بالکل صاف۔ بتایئے۔ ہاں ہاں بتایئے نا! معاشرے کے کس فرد کے لئے، کس شعبہ کے لئے یہ باعث تسکین ہے۔ وجہ طمانیت ہے، ضمیر کو جگایئے زبان کو دل کا رفیق بنایئے اور بہ بانگ دہل کہہ دیجئے کہ تعلیمی انحطاط کی ساری ذمہ داری صرف اور صرف طالب علم پر آتی ہے۔

اے خدا جو بھی مجھے پند شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو میرے زخم کی گہرائی دے
تیرے لوگوں سے گلہ ہے میرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا تو بینائی دے

تعلیم یافتہ معاشرہ ہی معاشی خوشحالی کا ضامن ہے (۱)

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا

اے مسند صدارت کی رونق اور ارباب محفل!

کسی قوم کی ترقی کا دارومدار وہاں کے بسنے والے افراد پر ہوتا ہے۔ اگر اس معاشرہ کے افراد تعلیم جیسی نعمت بے بہا سے بے بہرہ اور جہالت کے اندھیرے میں ڈیرہ جمائے ہوں گے تو ان کی سوچ محدود ہوگی۔ اور وہ زندگی کی دوڑ میں اقوام عالم کا مقابلہ نہ کر پائیں گے۔ اگر یہی معاشرہ تعلیم یافتہ ہوگا تو علم کی روشنی سے ان کے دل و دماغ، گلیاں و بازار اور شہر منور ہوں گے اور منور ہوتے رہیں گے۔

ہم سینچے ہیں کشت سحر اپنے لہو سے
مانگے ہوئے سورج سے سویرا نہیں ہوتا

صدر ذیشان!

اگر انسان کی زندگی کا مقصد محض کھانا پینا ہوتا تو وہ انسانیت سے گر کر صرف حیوان بن جاتا۔ وہ زندگی کی بے پناہ رنگینیوں اور رعنائیوں سے محظوظ نہ ہوتا اور ان سے لطف اندوز ہونے کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا۔ اس میں ذوق جمالیات پیدا ہی نہ ہوتا۔ نیکی و بدی کی تمیز ختم ہو جاتی۔ سچ اور جھوٹ کا فرق مٹ جاتا۔ عدل و انصاف کا علم کبھی بلند نہ ہوتا۔ جب تعلیم سے محروم معاشرہ معرض وجود میں آئے گا تو نہ تو وہ تہذیب و تمدن کا عکاس ہوگا اور نہ ہی اعلیٰ اخلاق و کردار اور اعلیٰ اطوار دیکھنے میں آئیں گے۔ یہی وہ فکر تھی۔ جسے پیدا کرنے کے لئے معلم کائنات ﷺ نے صدیوں پہلے ارشاد فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَةٍ

یعنی علم کا حاصل کرنا ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے۔ لہٰذا تعلیم زیور انسانیت ہے۔ تعلیم ہی کی بدولت انسان نے قدرت کے سربستہ رازوں سے پردہ اٹھایا۔ نئی نئی ایجادات معرض وجود میں آئی ہیں۔ انسان نے فضاؤں، ہواؤں پر کنٹرول حاصل کیا ہے۔ سمندروں کی تہوں سے پوشیدہ خزانے نکالے ہیں۔ زمین کا سینہ چیر کر ہر قسم کی معدنیات پر تصرف حاصل کر لیا ہے۔ غرضیکہ انسان نے قدرت کے سربستہ خزانوں کو علم کی طاقت سے نکال کر اپنی معاشی حالت کو بہتر سے بہتر بنالیا ہے۔

اے کاروان علم وبصیرت!

تعلیم یافتہ معاشرے سے میری مراد اسلامی معاشرہ ہے۔ جس میں شامل ہو کر انسان کی چشم بصیرت روشن سے روشن تر ہوتی جاتی ہے۔ انسان حق و باطل کو پہچانتا ہے۔ انسان دل و دماغ کو جہالت کے مہیب اندھیروں سے نکال کر ایک ایسا ہی معاشرہ تشکیل دیتا ہے۔ جہاں بغض و حسد، دشمنی و عداوت اور حرص و آز کی گرد نہیں پڑتی۔ انصاف کے ترازو سے باطل و طاغوتی نظام اور ظلم و استحصال کا دور ختم ہو جاتا ہے۔ اس مثالی معاشرہ کی بدولت ترقی و خوشحالی کا پرچم اوج ثریا تک جا پہنچتا ہے۔

اے صدر ذی وقار!

علم ایک لازوال دولت ہے۔ علم ایک نور ہے۔ متاع خیر ہے۔ علم اندھیروں کی گہری کھائیوں سے نکال کر شعور و آگہی کی روشنیوں کے سمندر کے کنارے لا کھڑا کرتا ہے۔ علم تنہائی میں مونس و یاور، غریب الوطنی میں رفیق و غم گسار، خلوت میں ندیم، جلوت میں روشنی کا مینار، دشمن کے مقابلے میں ہتھیار اور ارباب محبت میں پھولوں کی مہکار ہے۔ جب تعلیم و تعلم سے انسان کے اندر اتنی خوبیاں پیدا ہو جائیں تو کیا وجہ ہے کہ معاشرہ معاشی خوشحالی کا ضامن نہ ہو۔

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبریل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

تعلیم یافتہ معاشرہ ہی معاشی خوشحالی کا ضامن ہے (۲)

میری میراث فن کو اس طرح اغیار نے چھینا
کہ خود جینے لگے اور میرا مشکل کر دیا جینا
اگر خیریت ملک و ملت آرزو داری
تو کر شمع علم روشن کہ ہر عظمت کا ہے زینا

صدر ذیشان اور ارباب بزم!

میں نے جس آغوش محبت میں شعور کی آنکھ کھولی ہے۔ وہ میری ماں کی مقدس گود ہے اور میرے ماں باپ کی شفقت کا دامن ہے۔ میری ماں نے میری لوریوں میں مادر وطن کی محبت کے گیت گائے ہیں۔ ان لبوں کے لمس نے میرے گالوں میں صبح آزادی کی ٹھنڈک بھر دی ہے۔ میرے باپ نے وطن عزیز پر نثار ہونے والے خون سے مجھے شعلہ جوالہ بنا دیا ہے۔ میں اپنے وطن پر کسی بھی مہیب اندھیرے کا وجود برداشت نہیں کر سکتا۔ میرے وطن عزیز پر شروع ہی سے جہالت کا دور دورہ ہے۔ جس کی وجہ سے معاشی بدحالی کے عفریت نے پوری ملت کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا ہے۔ میری رائے میں ناخواندگی اور جہالت، ناآشنائی و خود ستائی، نظم و ضبط اور منصوبہ بندی کو تباہ کرنے کا دوسرا نام ہے۔ ایک ناخواندہ انسان معاشی بدحالی، ذہنی پسماندگی، تمدنی زبوں حالی اور اخلاقی افلاس و نکبت کا شکار ہو جاتا ہے۔ جبکہ تعلیم یافتہ انسان سلیقہ مند، کفایت شعار اور معاملہ فہم ہوتا ہے۔ ایک جاہل مطلق انسان اپنی حیثیت اور مقام و منزلت سے ناآشنا ہوتا ہے۔ اسی لئے وہ وقت، دولت، سرمایہ، منصوبہ بندی اور کفایت شعاری کی نعمتوں کی قدر سے یکسر محروم ہونے کے باعث اپنی تنگی و ترشی کے عفریت کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ جب ایسے انسانوں کی کثرت ہو گی تو پھر پوری قوم کاسہ گدائی لئے اغیار کی نظر کرم کی محتاج ہو گی۔

مانگتے پھرتے ہیں اغیار سے مٹی کے چراغ
گھر کے خورشید پہ ڈال دیئے سائے ہم نے

اس ذلت و رسوائی کا توڑ اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ علم کی شمع صرف شہروں میں روشن نہ کی جائے بلکہ پورے ملک کے قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، بستی بستی سے لے کر جھاڑ پھونس کی تاریک جھونپڑیوں تک کو اس نور سے منور کیا جائے۔ دولت علم اس طرح لٹائی جائے کہ ایک خوانچہ فروش کی جھولی بھی ان موتیوں سے بھری ہوئی نظر آئے۔

دوستوں کو بھی ملے درد کی دولت یا رب
میرا اپنا ہی بھلا ہو مجھے منظور نہیں

صدر ذی وقار!

علم شان ہے، علم آن ہے، علم زندگی ہے، علم خوشحالی ہے، جہالت بدحالی ہے، علم معراج انسانی ہے، جہالت و ناخواندگی، افلاس و نکبت کی ارزانی ہے۔ علم دولت کے فراوانی کی سیڑھی ہے۔ جہالت خود کھیت کو کھا جانے والی باڑ ہے۔ اٹھو قوم کے سپوتو اٹھو! جہالت کی دیوار کی خشت اول بھی اپنے وطن سے نکال کر باہر پھینک دو۔ ناخواندگی کے پہاڑ کو پاش پاش کر دو اور علم کا وہ چراغ روشن کرو کہ ناخواندگی اور بے علمی کی تاریکیاں چھٹ جائیں۔ اے علم و فضل اور جہد مسلسل کی نیا کے کھیون ہارو۔

میری مانو چلو منجدھار میں موجوں سے ٹکرائیں
وگرنہ دیکھنا ساحل پہ سارے ڈوب جائیں گے

صدر ذی وقار!

یہ کسے معلوم نہیں کہ علم کی بدولت انسان مسجود ملائک بنا، فرشتے کم علمی کے باعث ساجد ہوئے۔ علم نے انسان کو غاروں سے نکالا۔ بے علمی نے حیوان کو غاروں میں دھکیلا۔ علم نے انسان کو تخت شاہی بخشا۔ بے علمی نے حیوان کو تخت کا بوجھ اٹھانے پر مجبور کر دیا۔ علم سے انسان آقا بنا۔ بے علمی سے حیوان غلام ہوا۔ یہ علم ہی کی وجہ سے عرش پر پہنچا۔ اور وہ جہالت

کا مارا فرش کی خاک چھانتا پھرتا ہے۔ حیوان اپنے آپ کو بھی نہ پہچان سکا۔ اور علم سے انسان خدا کی ذات کو پا گیا۔ جب تک میرے ملک میں ناخواندگی کی جگہ خواندگی اور جہالت کی جگہ علم کے جھنڈے نہیں گاڑے جائیں گے میرا ملک اور میری قوم تنگی و ترشی کی بھٹی میں اسی طرح جل جل کر بھسم ہوتے رہیں گے۔ غربت و افلاس کے سائے اپنی تاریکیاں پھیلاتے رہیں گے۔ بھوک اور ننگ سے بچے بلبلاتے ہیں گے۔

اے ارباب فکر و نظر!

آخر میں ایک فرق واضح کیا چاہتا ہوں کہ خواندگی سے مراد وہ خواندگی ہرگز نہیں ہونی چاہئے کہ علم حاصل کر کے بھی ذہنوں پر جمود طاری رہے۔ ایک ڈاکٹر ایم۔ بی۔ بی۔ ایس کی ڈگری کے حصول کے بعد بھی اغیار کے نسخوں کا محتاج رہے۔ مسند انصاف پر بیٹھنے والا عظمت کے حصول کے بعد بھی مغربی افکار سے مرعوب ہو ہم ایسی تعلیم اور خواندگی کو باعث شرم سمجھتے ہیں جو صرف کلرک بادشاہ کے ذہن کے لوگ پیدا کرے۔ بلکہ میرے ملک اور قوم کو ایسی تعلیم اور خواندگی کی ضرورت ہے جس سے شرافت، دیانت اور حب الوطنی کے جذبات کو فروغ ملے۔ ہم ایسے علم کی جستجو میں ہیں جو تحقیقی، تخلیقی اور تکنیکی ذہن پیدا کرے۔ ہم ایسی خواندگی کی تلاش میں ہیں جو قوم کو اس جذبے سے سرشار کرے کہ ملک کو معاشی پسماندگی جیسی تمام تاریکیوں سے نجات دلائے۔

تاریکیاں ہیں ہر طرف اندھا نہ بن اب بھی سنبھل
ایمان کا فانوس لے اس میں جلا شمع عمل

ناخواندگی معاشی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ ہے

خودی ہو علم سے محکم تو غیرت جبرئیل
اگر ہو عشق سے محکم تو صور اسرافیل

صدر ذیشان!

خالق لوح و قلم کی تخلیقات اولیں میں سے لوح محفوظ خواندگی ہے اس لوح محفوظ کے اسماء کلی کی آگہی سے حضرت آدم علیہ السلام مسجود ملائک ہوئے اور آج تک ان کے ورثاء اولاد آدم بھی اسی خواندگی اسی علم اور لوح محفوظ کے محفوظات پر دسترس کی وجہ سے افضل و اشرف مخلوقات کا اعزاز حاصل کیے ہوئے ہیں۔

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توقیر گھٹتی ہے
میں مسجود ملائک ہوں مجھے انساں ہی رہنے دو

عالی جاہ!

بالفاظ دیگر یوں کہہ لیجئے کہ خواندگی صوتی تصاویر بنانا اور ان کو سمجھنے کا نام ہے۔ ابتدائے آفرینش سے خواندگی ہی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھی گئی ہے۔ ناخواندگی کبھی بھی بنظر استحسان نہیں دیکھی گئی یہی خواندگی ایک نظریہ بھی ہے۔ اور انسانی تجربہ بھی ہے۔ جو آدمی کو برتری عطا کرتا ہے۔

جناب مکرم!

رہا معاشیات کا مسئلہ تو اس سلسلہ میں وضاحت کرتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ معاش وہ پہلوئے حیات ہے۔ جس پر حیات مستعار کا دارومدار ہے۔ اور انسانی زندگی کو استحکام دینے کا زینہ ہے بلکہ بعض جدت و قدامت پسند حضرات نے تو اسے اسلام کا چھٹا رکن قرار دیا ہے۔ شائد یہی وجہ ہے کہ عالمی سطح پر اس کی اتنی ہی اہمیت ہے جتنی قومی و انفرادی سطح پر ہے۔

حضرات باتمکین!

معاش آدمی کی اجتماعی ترقی کا پھل ہے۔ جو ہر ایک کی آسائش کا ذریعہ ہے۔ البتہ معاشی پسماندگی کی سب سے بڑی وجہ جس عمل کو قرار دیا گیا ہے۔ وہ ناخواندگی ہی ہے۔ قردن اولیٰ کے انسان بھی ناخواندگی کی دلدل میں پھنسے ہونے کے باوصف کچھ نہ کچھ علم حاصل کرنے پر مجبور تھے۔ معاشی جدت وندرت کے اصول ہی خواندگی کے مرہون منت ہیں۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ جانوروں میں سے کون سا جانور ہے جس نے ایم اے معاشیات کیا ہوا ہے اور وہ جانور بھی پیٹ بھر کر کھاتا ہے اور جس نے ایم اے معاشیات نہیں کیا۔

صدر ذیشان!

جواباً عرض ہے کہ بتایئے بھینس چارہ کھاتی ہے۔ تو وہ گوشت کیوں نہیں کھاتی درندے گوشت کھاتے ہیں وہ چارہ کیوں نہیں کھاتے آبی جانور خشکی پر اپنی موت تصور کیوں کرتے ہیں۔ خشکی کے جانور سمندروں میں زندگی بسر کرنے سے گریز کیوں کرتے ہیں۔ جناب بات صرف اتنی ہے کہ انہیں جتنے علم کی ضرورت تھی۔ خالق کائنات نے انہیں اتنا علم دے دیا اس سے زیادہ ان کو نہ ضرورت ہے نہ حاجت البتہ علم انسانیت کا حصہ ہے۔ انسان اول کو علم کلی دے کر جاگیر علم کا وارث قرار دیا گیا۔ اس لئے ابتدائے آفرینش سے اب تک اور اب سے تا روز قیامت علم کی گہرائیوں میں شناور ہونا انسان کی ضرورت ہے۔ اس طرح معیشت روز اول سے ترقی پذیر ہے۔

حضرات محترم!

کبھی انسان کسب معاش کے لئے دقیانوسی ہتھیار استعمال کرتا تھا۔ اس تیز رفتار دور میں جو لوگ جدید علوم سے محروم ہیں۔ وہ معاش و معاشرت میں بیساکھیوں کے محتاج ہیں۔

اے علم و ہنر کی دنیا کے راہیو!

اب آخر میں عرض کرنا ضروری خیال کرتا ہوں کہ موضوع بحث میں ناخواندگی کے

ساتھ ساتھ اعلیٰ اخلاقی اقدار کی شرط کا اضافہ کر دیا جاتا تو بے جا نہ ہوتا۔ کیونکہ اس مادیاتی دنیا میں اعلیٰ تعلیم یافتہ لیکن حسن اخلاق سے محروم لوگ تو معاشرے کے لئے مار آستیں سے زیادہ خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اس مختصر اضافے کے ساتھ اپنے موضوع کے حق میں علم وفضل کی، راہ کے ساتھی کو عرض کرنا چاہوں گا۔

طوفاں سے کھیلتا ہوا دریا عبور کر
مقصود ہے عبور ترا ڈوبنا نہیں

کیا طاعت مدام کا انعام ہے یہی
یوں جی رہے ہیں جیسے ہمارا خدا نہیں

خواتین اور مردوں کے مساوی حقوق ہی قومی ترقی کے ضامن ہیں؟ (۱)

مصائب کا مداوا چاہتی ہے تیسری دنیا
مگر ایسا جہاں کے چوہدری ہونے نہیں دیتے

صدر ذی احتشام اور ارباب فکر ونظر!

یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ مرد و عورت کائنات کے رعنائیوں کا محور بھی ہیں اور زیور بھی، رب ذوالجلال نے اگرچہ تخلیق پہلے مرد کی کی ہے لیکن مرد تن تنہا بوریت کا شکار رہا۔ مجھے یقین کامل ہے کہ اگر خدائے قدوس و برتر اس بوریت کو دور کرنے کے لئے صنف نازک منصۂ شہود پہ نہ لاتا تو مرد مر جاتا یکتائی صرف خدائے واحد کو زیب ہے۔ اس نے انسانی فلاح و بہبود کی خاطر اماں حوا علیہا السلام کو پیدا کیا۔

عجیب زمانہ آیا کہ وہی اماں حوا جس نے اس دنیا فانی کو بھی خوبصورت بنا دیا جس نے یہاں کی کلفتوں، تکلیفوں اور مصائب و آلام کی بھیانک رات کو اپنی مسکراہٹوں، لوریوں، ممتا کی محبتوں اور بہنوں کی شفقتوں میں تبدیل کر دیا۔ جینے کا سلیقہ دیا، تہذیب و تمدن کا پہلا مدرسہ ثابت ہوئی۔ اب اسے مرد کے برابر حقوق دینے سے انکار کیا جا رہا ہے۔

جناب مکرم!

اگر کسی پہاڑی زندگی، جہالت کی زندگی یا عرب کے گڈریوں، قبل از اسلام باعث شرم زندگی یا ہندوستان میں ہندوستانی غیر مسلموں کی اوہام پرستانہ زندگی کی بات ہوتی تو ہمیں حیرت نہ ہوتی۔ حیرت تو اس بات پر ہو رہی ہے کہ یہ راگ الاپنے والے اور صنف نازک کو غیر مساوی حقوق دینے والے اس معاشرے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جس معاشرے کے ہادئ اعظم، معلم انسانیت رہبر کامل حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ ترقی کی منازل کے ابتدائی سنگ میل

میں تعلیم میں مرد وعورت دونوں کو برابر فرما کر ارشاد فرمایا:

طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِیْضَۃٌ عَلٰی کُلِّ مُسْلِمٍ وَّ مُسْلِمَۃٍ

کہ حصول علم ہر مسلمان مرد وعورت پر فرض ہے اور علم ہی تو ترقی کی راہیں متعین کرتا ہے اور میرے آقا و مولا ﷺ نے مسلم کے لفظ کے استعمال سے اس طرف بھی اشارہ فرمایا کہ ہوسکتا ہے کہ غیر مسلم تہذیب کے دلدادگان مسلمان عورت کی ترقی وفلاح کی پہلی سیڑھی سے ہی محروم کردیں گویا ابتدائی راہنمائی آپ نے فرمادی اور آگے کی منازل خود طے ہوتی رہیں گی۔

صدر ذیشان!

اگر مرد علم وفضل کی دنیا کا شہنشاہ ہو بھی جائے تو ضروری نہیں کہ اس کی اولاد بھی ملک و ملت کی ترقی وفلاح میں اس کی اتنی ہی معاون بن سکے جتنا کہ وہ خود ہے لیکن یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر عورت تعلیم یافتہ ہے تو اس کی اولاد اور بچے بھی معاشرے کا ایک مفید رکن بن کر، تہذیب وتمدن کا ذمہ دار فرد بن کر مستقبل کا روشن ستارہ بن کر ترقی کی شاہراہوں کے ضامن ہوں گے لیکن خدا شعور بخشے ان ناعاقبت اندیشوں کو جو عورتوں کو برابری کے حقوق سے محروم کر کے اپنے ہی پاؤں پر کلہاڑی مار رہے ہیں۔

کب دیکھتے ہیں اپنے گریباں میں جھانک کر
بس دوسروں کے عیب گنوانے کا شوق ہے

حضرات باتمکین!

قومی وملکی ترقی کی راہوں کے راہی کے لئے جن عوامل کی ضرورت ہوتی ہے۔ ذرا بتائیے تو؟ خواتین میں ان عوامل میں کس چیز کی کمی ہے دو ہاتھ ہیں، دو پاؤں ہیں، اعلیٰ دماغی صلاحیتیں ہیں، فکر وتدبیر کی گہرائی، معاملہ فہمی، دور اندیشی، قوت فیصلہ خود اعتمادی غرض قدرت نے تخلیق کے وقت صنف نازک میں نازکی اور رعنائی کے تحائف کے علاوہ ہر وہ صلاحیت بخشی ہے۔ جو مرد میں موجود ہے اور ترقی کے لئے معاون ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ

جہاں جہاں عورت نے مرد کا ساتھ دیا منازل خود بخود قدم چومتی رہیں اور اگر نظر انداز کرنے کی ٹھان ہی لی ہے تو خواتین کی نمائندگی میں اتنا ضرور عرض کروں گا۔

آپ سجدے میرے رد کر دیجئے
میرا کیا ہے میں اٹھ کر چلا جاؤں گا
کل کہیں آپ ہی کو نہ کہنا پڑے
اک جبیں چاہئے سنگ در کے لئے

اے ارباب محفل!

وطن دشمن عناصر ناعاقبت اندیش لوگ کیوں نہیں سوچتے کہ مغربی اقوام نے انسانی آبادی کے اس پچاس فیصد حصہ کو ساتھ ملا لیا۔ قدم قدم ساتھ لے کر چلے سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں، ملوں، لیبارٹریوں سے خلا کی تسخیر تک ساتھ لے کر بام ثریا پر تھگلی لگا رہے ہیں۔ چاند اور مریخ کو روند چکے ہیں اور یہ ناعاقبت اندیش لوگ اسے گھر کی چار دیواری میں بند کر کے ابھی تک اپنے ملک میں سوئی تک بنانے کی اہلیت حاصل نہ کر سکے۔

کھول آنکھ، زمین دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ
مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اے مسند نشین صدارت!

اب آخر میں ایوان اقتدار کی قرارداد کی بھرپور حمائت کرتے ہوئے عرض کروں گا کہ زندگی کی گاڑی کے دونوں پہیے برابری کے حقوق سے سرفراز ہیں اور اگر قومی زندگی میں ترقی کی راہوں پر چلنا ہے تو معاشرے کے ہر فرد و بشر پر مرد و عورت کی برابری کی ضمانت دیتے ہوئے ایوان حاضر کو بھی قرارداد کے حق میں ووٹ دینا ہوگا۔

اس بزم میں مجھ سے کہتے ہیں موقع کے مطابق بات کرو
اور ہم نے یہ دل میں ٹھانی ہے یا دل کی کہیں یا کچھ نہ کہیں

خواتین اور مردوں کے مساوی حقوق ہی قومی ترقی کے ضامن نہیں ہیں (۲)

آئیں گی جب کالجوں سے پاس ہو کر بیبیاں
حکمراں مردوں پہ ہوں گی مثل افسر بیبیاں
حکم قرآں ہے کہ منہ تک بھی رہے زیر نقاب
اور یہاں پھرتی ہیں کھولے سر بھی اکثر بیبیاں

اے مسند صدارت کی رونق اور اے محفل دانشوراں!

میں حیران ہوں کہ بعض لوگ کتنے چرب زبان ہوتے ہیں اور حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے میں کتنی مہارت رکھتے ہیں۔ حق وصداقت کے سوتے خشک کیوں ہو جاتے ہیں۔ شرافت و دیانت کو آواز دو کہاں ہے کہ کرے کوئی اس بندہ گستاخ کا منہ بند۔ مرد و عورت گاڑی کے دو پہیے، گاڑی کے دو پہیے کی رٹ لگا لگا کر گلا پھاڑے جا رہے تھے۔ او بھائی! ہوش کے ناخن لو۔ مساوی حقوق کے دعویدارو! گاڑی کے دونوں پہیے اپنی اپنی جگہ رہیں گے تو گاڑی چلے گی۔ اگر دونوں پہیے ایک ہی جگہ فٹ کر دو گے تو نہ صرف گاڑی کا ستیاناس ہو جائے گا۔ بلکہ اصل منزل ہی نظروں سے اوجھل ہو جائے گی۔ مرد پہیہ اپنی جگہ یعنی کائنات کی وسیع و بسیط وسعتوں میں مصروف عمل رہنا اور عورت پہیہ اپنی جگہ یعنی گھر کی چار دیواری جیسے مرد کو گھر کی چار دیواری میں محبوس کر کے زندگی کو مفلوج نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح عورت کو گھر سے باہر نکال کر بچوں کو شفقت سے محروم نہیں رکھا جا سکتا۔

اپنا کام تو سمجھانا ہے اے دل، رشتہ جوڑ کہ توڑ
ہجر کی راتیں لاکھ کروڑوں وصل کے لمحے پانچ کہ سات

حضرات باتمکین!

جس طرح جج صاحبان کا مسند انصاف چھوڑ کر کتابت سیکھنے میں مصروف ہو جانے پر انصاف کے طالب ٹھوکریں کھاتے پھریں گے بالکل اسی طرح اس عظیم ماں کی گود سے محروم ہو جانے والے بچے گلیوں اور بازاروں میں خاک چھانتے پھریں گے اور ماں! ماشاء اللہ قومی ترقی کے حصول میں مرد کے مساوی حقوق کی تلاش میں ستاروں سے آگے کے جہان کی تلاش میں ہوگی۔

پڑھائے گی یہ خاوند کو بڑی استاد نکلے گی
کہ بی اے کر کے لڑکی کا ارادہ اب ہے بی ٹی کا

صدر ذی وقار!

قوم کی سب سے پہلی منزل علم کا حوالہ دیتے ہوئے موصوف برابری کے حقوق کی آڑ میں لفاظی بکھیر رہے تھے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ تعلیم انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مدارج سے آشنا کرتی ہے۔ شرافت، محبت اور اخوت اور پیار کا سبق دیتی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر عورت گھر سے قومی ترقی اور اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے میدان میں نکل ہی آئی ہے تو اسے دیکھ کر سر عقیدت سے جھک جاتا۔ خراج نیاز پیش کرنے کو جی چاہتا ہے اور برملا کہنا پڑتا، کہ

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توقیر گھٹتی ہے
میں مسجود ملائک ہوں مجھے انساں ہی رہنے دو

لیکن ہوا کیا؟ آج کی اس نام نہاد تعلیم نے ترقی معکوس کے بھیانک مقام پر لا کھڑا کیا ہے اور عورت راحت و رحمت بننے کی بجائے زحمت اور خطرے کا نشان بن گئی ہے۔

سرخ تلوے، سرخ ناخن، سرخ لب
ڈینجرس ہی ڈینجرس ہیں عضو سب

اے میری قوم کی ماؤ، بہنو اور بیٹیو!

تمہاری ترقی، تمہارا عروج اور تمہاری قوم کی ترقی وعروج مرد کے ساتھ ساتھ سڑکوں، دفتروں اور بازاروں میں دھکے کھانے میں نہیں۔ تمہاری جنت، تمہاری اور تمہاری قوم کی ترقی وفلاح کا مرکز تمہارا گھر ہے۔ جو پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اے صنف نازک، اے فطرت خداوندی کے حسین شاہکار تو اخباروں، رسالوں کی زینت بننے کے لئے نہیں، ٹی وی، ریڈیو، فلموں میں ناچنے گانے اور تھرکنے میں تمہارا وقار نہیں۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا جا کر غیر محرموں سے فرینڈ شپ بڑھانے میں تمہارا تقدس نہیں آؤ، گھر لوٹ آؤ۔ تمہارا سکون، تمہاری عزت، تمہاری قوم کی ترقی، اطمینان اور جنت تمہارا گھر ہے۔

اے صدر ذیشان اور ارباب محفل!

آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ حقوق کا مطالبہ کرنا ایک فیشن بن گیا ہے اور فرائض کی کوئی بات ہی نہیں کرتا۔ فرائض کو چھوڑ کر حقوق کی فہرست اتنی طویل ہو جائے گی جس کی پھر انتہا نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے کل کلاں کو مطالبہ ہو۔ اگر مرد چار چار بیویاں کر سکتا ہے تو ایک عورت چار مرد کیوں نہیں رکھ سکتی۔ آخر ایک چارپائی بھی تو چار پائے رکھتی ہے۔ پھر یہ بھی مطالبہ ہو سکتا ہے۔ مرد و شیر بنو! ایک سال بچہ ہم جنتی ہیں اور ایک سال بچہ تم جنو۔ اسی طرح یہ فہرست طویل سے طویل تر ہوتی جائے گی تو کیا کرو گے۔ شرم کرو، حیا کرو، چاند اور مریخ کا حوالہ دینے والوں سے کہنا چاہتا ہوں۔ کہ

چاند پر پہنچ جانا حقیقت سہی
چاند قدموں میں لانا بڑی بات ہے

جذبہ کبھی پابند سلاسل نہیں ہوتا

اس شہر میں ہر شخص پریشان سا کیوں ہے؟
آنکھوں میں جلن سینے میں طوفان سا کیوں ہے؟
دل ہے تو دھڑکنے کا بہانہ کوئی ڈھونڈے
پتھر کی طرح بے حس و بے جان سا کیوں ہے؟

صدر ذی وقار اور ارباب محفل!

اس جہان رنگ و بو میں بشر سے دو طاقتیں نبرد آزما رہی ہیں حق و صداقت کی جنگ کفر و باطل سے رہی، امن و آشتی کی ظلم و جور سے، روشنی کی اندھیروں سے اور علم کی جہالت سے جنگ کا بازار گرم رہا۔ اور جب تک یہ چاند کے ہالے سرکتے رہیں گے اور اوس کے موتی ڈھلکتے رہیں گے شائد یہ آویزش اس وقت تک جاری رہے۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اس باہمی جنگ و جدل میں پلہ کس کا بھاری رہا۔ امن و آشتی کا یا ظلم و بربریت کا اس کا تجریہ کئے بغیر ہم آج کے موضوع پر سیر حاصل گفتگو نہ کر سکیں گے۔

صدر ذی وقار!

احساسات و جذبات دل کی دھڑکنوں کا نام ہے۔ لطیف کیفیات ہمیشہ لطافت و محبت اور صداقت سے عبارت ہوتی ہیں۔ آمریت و چنگیزیت اور ظلم و بربریت سے اس کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ احساسات و جذبات اور دل کا طوفان جب برپا ہوتا ہے تو کوئی بھی اس طاقت کے سامنے بند نہ باندھ سکا۔ تاریخ عالم میں جب بھی کسی ظالم، جابر اور آمر نے ان جذبات کو دبانے کی ناکام کوشش کی تو وقتی طور پر اس کا سر ڈنڈے سے دبا کر فخر و غرور سے تن گیا لیکن وہ دلوں کی دنیا کو فتح نہ کر سکا۔ بلکہ نفرتوں کی لہروں کے تیز بہاؤ میں تنکے کی طرح بہہ گیا۔ فرعون نے بنی اسرائیل کو صدیوں اپنے جبر کے شکنجے میں جکڑے رکھا اور ظلم و جور کے

ان پر پہاڑ توڑے لیکن۔

بشر بے چین ہو تو انقلاب آیا ہی کرتا ہے
گلوں کے داغ دھونے کو سحاب آیا ہی کرتا ہے
پرانے ساغروں میں جب کھنک باقی نہیں رہتی
تو گردش میں نیا جام شراب آیا ہی کرتا ہے

خدائے بزرگ و برتر نے اس ستم و جور میں تڑپنے والی اسرائیلی مخلوق کی پکار سنی اور آزادی کی نعمت سے نوازا اور ظالم کی ساری ذریت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دریا برد کر دیا۔

رو کے نہ گئے طوق و سلاسل سے یہ جذبے
جو دل میں ہوا وہ بیاں ہم نے کیا ہے
ہونٹ اب بھی سیئے جاتے ہیں حق بات پر اکثر
ہر چند یہ سودا ہے گراں ہم نے کیا ہے

اے صدر ذیشان!

اگر یہ سوال کیا جائے کہ دنیا میں سب سے طاقتور چیز کیا ہے تو ہر ایک کا جواب دوسرے سے مختلف ہوگا۔ کسی کے خیال میں قلم زیادہ طاقتور ہے اور کسی کے خیال میں تلوار یہ جملہ قیاس آرائیاں اپنی اپنی جگہ درست مگر ایک طاقت ایسی ہے جو ان میں سب سے بڑی طاقتور ہے؟ برتر ہے، عظیم ہے اور وہ ہے جذبہ جتنی طاقت جذبہ میں ہے شاید ہی کسی اور چیز میں ہو۔

آپ ہر چیز کو قید کر سکتے ہیں۔ شیر جنگل کا بادشاہ ہے۔ اسے پنجرے میں قید کر کے زنجیروں میں جکڑ سکتے ہیں۔ شاہین اور عقاب کو قفس میں قید کر سکتے ہیں۔ ایک انسان کے ظاہری اعضاء کو بیڑیاں پہنا سکتے ہیں۔ مگر جذبہ ایک ایسی طاقت ہے۔ جو آپ کو ہمیشہ آزادی کے افق پر چمکتا ہوا نظر آئے گا۔

کافر ہے تو پابند مہ وسال رہے گا
مومن ہے تو سرشار حیات ابدی ہے

حاضرین باتمکین!

اگر آپ کسی بے زبان پرندے کو کسی قفس میں قید کر لیں تو کیا آپ نے اس کی خواور فطرت کو غلام بنالیا۔نہیں جناب نہیں اگر اس کا بس چلے تو قفس کی تیلیوں کو جذبات کی تیز آگ میں جلا کر خاک سیاہ کر دے۔

عالی جاہ!

برصغیر پاک و ہند میں دیار غیر کے باسیوں نے غاصبانہ قبضہ کیا اور اپنے جبر و استبداد کے پنجے ایسے گاڑے کہ زندگی اجیرن کر دی مسلمانوں کی جائیدادیں ضبط کر لیں۔ملازمتوں کے دروازے بند کر دیئے۔علم وفضل کے موتیوں سے محروم کرنے پر پورا زور لگا دیا۔غرض ہر وہ حربہ جو ایک ظالم اپنے ظلم کے شکنجے کو مضبوط کرنے کے لئے استعمال کر سکتا ہے۔اس نے کیا لیکن جب جذبہ آزادی نے کروٹ لی تو غلامی کی تمام زنجیروں کو توڑ کر رکھ دیا۔اور وہ جابر حکومت جس کی سلطنت میں سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔وہ اس سامان حرب وضرب سے محروم لیکن جذبات کے تمام ہتھیاروں سے لیس،قوم مسلم کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئی۔

عالی قدر،گرامی صدر!

الجزائر،تیونس،ویت نام اور خصوصاً فلسطین و افغانستان کے سامنے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو منہ کی کھانا پڑی۔اس طرح جموں وکشمیر کے باسیوں اور پاکستانیوں کی غیرت ایمانی اور جذبہ آزادی سلامت رہا۔اللہ سلامت رکھے تو دیکھنا۔ایک دن اس نام نہاد طاقت کی غلامی کی زنجیر وسلاسل کی دھجیاں اڑا دی جائیں گی۔اور یہ بات ثابت کر دی جائے گی کہ جذبہ کبھی پابند سلاسل نہیں ہوتا۔

اے مسند صدارت کی رونق اور ارباب محفل!

آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ڈنڈے سے سروں پر حکومت کرنے والے، آمر پابند سلاسل کرنے والے، ظالم و جابر کے جبر و استبداد کے پنجے گاڑنے والے، جابر اور سامان حرب وضرب سے دہشتیں پھیلا کر قوموں کو غلام بنانے والے شیطان صفت انسان تاریخ کے عبرت ناک اوراق ان کے سامنے ہیں۔ جب بھی ایسا ہوا تو دلوں کی نازک دھڑکنیں اور جذبوں نے آمریت کی زنجیروں کو جابر و ظالم کے ظلم اور جبر کو توڑ کر رکھ دیا۔ پھر ہر ظالم، ہر آمر ہر فرعون اور ہر یزید خود اپنی ہی نفرتوں کی زنجیروں میں قید ہو کر رہ گیا۔

نہ یزید کا وہ ستم رہا نہ زیاد کی وہ جفا رہی
جو رہا تو نام حسین رضی اللہ عنہ کا جسے زندہ رکھتی ہے کربلا

انسان کی ترقی کے لئے سائنس کی ترقی ضروری ہے

سکھا دیتی ہے قدرت جن کو انداز جہاں بانی
وہ ہر الجھی ہوئی گتھی کو سلجھایا ہی کرتے ہیں
جو چلتے ہیں انہیں کو راہ میں ٹھوکر بھی لگتی ہے
یہ ٹھوکر کھا کے خوش قسمت سنبھل جایا ہی کرتے ہیں

میر مجلس! فاضلان ایوان اور میرے عزیز ساتھیو!

آج جس ایوان میں آپ بیٹھے ہیں۔ ذرا اس کی چھت کی جانب دیکھنے کی تکلیف گوارا کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ آپ کے ایوان کو بقعۂ نور بنانے والے قمقمے اور آپکے مشام جان کو خنک اور فرحت بخش ہوا دینے والے پنکھے یہ کیا ہیں؟ یہ کرشمہ ہے سائنس کا۔ یہ اعجاز ہے تحقیق و تدقیق کا۔ یہ ثمر ہے ابن آدم کی ان تھک محنت، فکر رسا اور عمل پیہم کا۔ جو اس نے تسخیر کائنات کا فرض منصبی ادا کرتے ہوئے کیا ہے اس نے آیات الٰہیہ کو سامنے رکھا اور ان سے سبق حاصل کیا اسی نے اختلاف لیل و نہار کو دیکھا چمکتے ستارے دمکتے چاند کی روپہلی کرنیں، وسیع سمندروں کے سینوں کو چیرنے والی کشتیاں اور ان کے رخ موڑنے والے بادبان، ہلکے پھلکے اور دبیز بادلوں کے غالے، ان میں برستی بارش، چمکتی گرجتی اور گرتی بجلیاں، اوس کے ڈھلکتے موتی، چرخ نیلی فام پہ پھیلی ہوئی کہکشائیں، ان سب میں غور کیا۔ فکر کیا۔ تدبر سے کام لیا، ثوابت و سیار کو محکوم محض بنایا اور بدیہی نتائج حاصل کئے اور ثابت کر دیا کہ انسان اشرف المخلوقات ہے اور وہی کائنات کا منتہائے مقصود ہے۔ کیونکہ ہاتف غیبی کی یہ صدا اس کے کانوں میں متواتر تعاش ہے کہ

وَ سَخَّرَ لَكُمُ الشَّمْسَ وَ الْقَمَرَ (ابراہیم:33)

''یعنی سورج اور چاند کو تمہارے لئے ہی مسخر کر دیا ہے''۔

صاحب مسند صدارت!

ایک وہ وقت تھا کہ انسان جوتیاں چٹخاتا پھرتا تھا۔تب کہیں جا کر چند میل کا فاصلہ طے کر پاتا تھا اور اب یہ حقیقت کہ چشم زدن میں خلا کی وسعتوں میں تہلکا مچا دیتا ہے۔مریخ، چاند، ثریا اور دیگر اجرام فلکی ابن آدم کی قدم بوسی کے لئے بے تاب ہیں ورنہ یہی وہ انسان تھا کہ اجرام فلکی تو بہت دور کی بات ہے۔ان سے کم تر اشیاء کو بھی اپنا معبود تصور کرتا تھا۔اور حالت یہ تھی کہ کس نمی برسد کہ بھیا کیستی؟ (کوئی نہیں پوچھتا کہ بھائی تم کون ہو؟) لیکن آج عروج آدم خاکی سے انجم سہمے جاتے ہیں۔کیوں؟ صرف اس لئے کہ اس نے یہ راز پالیا ہے کہ وہ خلیفۃ اللہ فی الارض ہے اور اپنے خالق کی دی ہوئی توانائیوں کو بروئے کار لا رہا ہے اور اپنے علم سے تسخیر کا دائرہ وسیع کر رہا ہے اور یہی اس کی ترقی وعروج کا زینہ ہے۔

صدر گرامی قدر!

سائنس اور اس سے متعلقہ علوم ہماری میراث ہیں۔لیکن ان پر اجارہ یورپی بلاک کا ہے۔اور جب ہم اس غصب شدہ میراث کی طرف بڑھتے ہیں اور اس کے حصول کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں تو وہ ہمیں اس انداز سے غصے کے عالم میں دیکھتے ہیں۔دھمکیاں دیتے ہیں کہ جیسے ہم نے کسی شجر ممنوعہ کو ہاتھ لگا دیا ہو۔

عالی جاہ اور ارباب محبت!

تخلیقات خالق ارض وسما میں غور وفکر ہمارے دین کا حصہ ہے۔ہمارے عروج کا راز ہے۔ہماری زندگی ہے اور ہماری آن ہے اس کے حصول کے لئے ہمیں تن من دھن کی قربانیاں دینا ہوں گی اور خود بھی غور وخوض کرنا ہو گا۔اور جو ہمیں اپنی میراث سے محروم کرنے کی کوشش کرے اس کی کلائی کو توڑنا بھی ہو گا۔

اور تو کچھ کہ نہیں سکتا کہ کیا تھا کون تھا
بات سچی کہنے والا سب کو دیوانہ لگا

بیسویں صدی انسانیت کی قاتل ہے

اے خدا اب تیرے فردوس پہ میرا حق ہے
تو نے اس دور کے دوزخ میں جلایا ہے مجھے

صدر محترم اور محفل دانشوراں!

کیا سہانا وقت ہوگا۔ جب انسان انس و مروت کا پیکر تھا۔ الفت و محبت کا مجسمہ تھا۔ خلوص و وفا اور اخوت و مؤدت جیسے ثقیل معانی سے ناواقف ہوتے ہوئے بھی اس احساس سے آشنا تھا۔ اس کی گلیوں میں اتنی چکاچوند نہ تھی قمقموں اور ٹیوبوں سے اس کا گھر بقعۂ نور نہ تھا لیکن دلوں میں اتنا اندھیرا بھی نہ تھا۔ مکر و فریب، حسد و بغض اور کینہ کی غلاظتیں اس کے دامن دل کو متعفن نہ کرتی تھیں۔ مگر آج اس ترقی یافتہ سائنسی اور مادی دور نے آسائشیں فراہم کر کے بے سکونی و بے اطمینانی کی ایک مسلسل چبھن تحفہ میں دی ہے۔

آج کل کی روشنی نے کر دکھائے کام دو
گھر کو روشن کر دیا دل میں اندھیرا کر دیا

خود غرضی و خود پروری کی چاہتوں نے سوچ اور فکر کے زاویے مختلف کر دیئے ہیں۔ اب انسان خود اعتمادی کے محور سے ہٹ کر ریزہ ریزہ ہو کر حریفوں میں بٹ گیا ہے اپنی جھوٹی انا کی پیاس نے اسے اندھا کر دیا ہے۔ اب اس دور کے انسان نے آنکھوں میں چاہتوں اور محبتوں کی طراوت کا کوئی تصور نہیں چھوڑا۔

اپنی زباں تو بند ہے تم خود ہی سوچ لو
پڑتا نہیں ہے یونہی ستمگر کسی کا نام

حضرات باتمکین!

ظاہر بین نگاہیں، فلک بوس عمارات کو دیکھ کر مسحور تو ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان بلند و بالا

عمارتوں کی بنیادوں میں انسانیت کے خون کو کون دیکھے گا۔ دیکھنے والے سائنسی اور ایٹمی ترقی کے گن تو گا سکتے ہیں لیکن ہیروشیما، ناگا ساکی، فلسطین، ویت نام، کشمیر وافغانستان، عراق اور ہندوستان میں مسلمان اقلیت کی چیخوں اور تڑپتے لاشوں کے کرب کو کون محسوس کرے گا۔ گلاب کو سینکڑوں رنگ وروپ بخش کر خوش ہونے والو! اب اس کی بھینی بھینی خوشبو کہاں سے تلاش کرو گے۔ اے ثریا و مریخ پر کمندیں ڈالنے والو! آج اپنے افکار کی دنیا میں سفر کون کرے گا۔ اے خون انساں ارزاں سے ارزاں تر کرنے والو اور انسانوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹ کر رکھ دینے والو! پھر اس کے خون سے اپنے لبوں کو سرخی دے کر اترانے والو! تمہیں جب خود اپنے لئے سکون کی ضرورت ہوگی جب تم خود بے سہارا ہو جاؤ گے جب تمہیں خود ایک فریاد سننے والے کی ضرورت محسوس ہوگی تو اس دکھ کا مداوا کہاں سے کرو گے۔

لٹتے ہوئے عوام کے گھر بار دیکھ کر
اے شہر یار! تیرا کلیجہ نہ پھٹ گیا

صدر محترم!

مجھے اعتراف ہے کہ تاریخ انسانی میں ایسے خونچکاں حادثے کثرت سے ملتے ہیں۔ انسانیت کے خون سے ہولی کھیلی جاتی رہی ہے۔ انسانوں کی کھوپڑیوں پر مینار تعمیر ہوتے رہے ہیں۔ ان کی ہڈیوں کو قبروں سے نکال کر دستر خوان بچھائے جاتے رہے ہیں۔ چیخوں کے بدلے قہقہے بھی اس فضائے آسمانی نے سنے ہوں گے۔ ان چاند ستاروں اور آفتاب درخشاں نے بیسیوں بغداد تباہ ہوتے دیکھے ہوں گے۔ ڈھاکے لٹتے دیکھے ہوں گے۔ اعضاء انسانی کو ایک ایک کر کے جدا ہوتے اور کٹتے دیکھا ہوگا لیکن جس ہمہ گیر کرب میں انسانیت آج مبتلا ہے۔ جس طرح انسانیت کو اسکے اصل انس و مروت سے آج محروم کر دیا گیا ہے۔ خون انسانی جیسے آج ارزاں ہو رہا ہے۔ قتل و غارت کا بازار جس طرح اب گرم ہوا ہے۔ مہلک ہتھیاروں سے گھر بار سجائے جا رہے ہیں۔ جس انداز کے ساتھ راہزنوں

نے قبائیں چھین کر راہنمائی کا جامہ پہن لیا ہے جس طرح آج اپنے بیگانے ہو رہے ہیں ایسا کبھی پہلے تو نہ دیکھا تھا اور نہ سنا تھا۔ محسوس ہوتا ہے کہ بیسویں صدی پوری انسانیت کے قاتل ہونے کا کلنک کا ٹیکہ لگائے فخر محسوس کر رہی ہے۔

ہر کسی کے ہاتھ میں صابر ہے نفرت کی چھری
کوچہ و بازار جیسے سارے مقتل ہو گئے

پاکستان کی ترقی کا دارومدار سیاست پر نہیں سائنس پر ہے

اے بہار آفریں ہواؤ چلو
پھر چلے دور کیف عرفانی
پھر فضاؤں میں پھول برساؤ
بھر دو دامان صحن بستانی

اے سرور مجلس دانشوراں!

میرا ملک پاکستان جس کی مانگ میں لاکھوں شہیدوں کے خون کی سرخی ابھی تک دمک رہی ہے۔ جس کی پیشانی کو یتیموں اور بیواؤں کے آنسوؤں کا جھومر ابھی تک مزین کر رہا ہے۔ وہاں انسانیت کے کردار اور ملک کی فضاء کو متعفن کر دینے والی موجودہ سیاست دانوں کی سڑاند اور بدبو سے ملوث کرنا کون گوارا کرے گا۔ عالیجاہ! میں نے جب سے شعور کی آنکھ کھولی ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کھلنڈرے اور بے فکروں کے اس ٹولے نے ملک کی لٹیا ڈبونے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔

متاع کارواں لٹنے کا کس کافر کو صدمہ ہے
ستم ہے لوٹنے والوں میں تیرا نام آیا ہے

حضرات گرامی!

میں اس پوزیشن میں تو نہیں کہ ملک اور قوم کے لئے یہ فیصلہ دے سکوں کہ اقتدار فوج کے ہاتھ میں ہو یا سیاستدانوں کے، البتہ میں تو صرف عرض کر سکتا ہوں کہ جو گندی سیاست میرے ملک کے باسی میرے ملک میں کھیل رہے ہیں۔ یہ اس کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ملکی سطح پر پچاس سال کے جوان رعنا ہو کر بھی غیروں کی امداد کی بیساکھی کے محتاج ہیں ہم ترقی معکوس کا شکار ہوئے تو ان کے ہاتھوں۔ ہماری کمر ٹوٹی تو اپنے مہربانوں کے ناروا بوجھ سے، ہمارا

بازو کٹا تو انہیں راہنماؤں کے روپ میں رہزنوں کے ہاتھوں۔

زمانے کے ستم تو سہہ ہی لیتے
رفیقوں کے کرم نے مار ڈالا

لوگو! ارے لوگو!

دیکھو زمانہ چال قیامت کی چل گیا، مغربی اقوام سائنس کی بدولت آسمان سے ستارے توڑ کر لا رہی ہیں۔ زمینوں کو کھنگال کر حیرت انگیز کارنامے سرانجام دے رہی ہیں۔ میرے پڑوس میں میرے ساتھ آزادی حاصل کرنے والی قوم سائنسی ترقی میں اس قدر آگے بڑھ گئی ہے کہ وہاں کے بنیئے جن کی دھوتی کے پیچ میرے نعرہ ہائے تکبیر و رسالت سے ہی ڈھیلے پڑ جایا کرتے تھے۔ آج چوبیس گھنٹوں کے اندر اندر مجھے پیس کر رکھ دینے کی دھمکیاں دے رہے ہیں میں سمجھتا ہوں کہ 1971ء میں سیاست دانوں کی اقتدار کی ہوس نے پوری قوم کو ذلیل کر کے دشمنوں کے حوصلے بڑھا دیئے ہیں لیکن۔

کس نے کس کا خون کیا ہے کس کس کو تم ڈھونڈو گے
دنیا والے رکھ لیتے ہیں ہاتھوں کو دستانوں میں

اے کرسی صدارت کی رونق!

ایک مجھ جیسا چھوٹا سا طالب علم بھی اس حقیقت کے راز سے آشنا ہے۔ کہ میرے ملک میں روشن خیال عظیم انسانوں اور ملکی معاشی حالات کے مطابق سائنس کے میدان میں اعلیٰ پیش رفت کرنے والے سائنس دانوں کی کمی نہیں ہے۔ جو مہ و انجم کی وسعتوں کو ماپ سکتے ہیں جو دھرتی کا سینہ چیر کر اپنا خراج وصول کر سکتے ہیں۔ لیکن ملک کا برسر اقتدار طبقہ اور حزب اختلاف کے سیاستدان جن کے لئے ہر ڈاک مغرب سے امداد کے نام پر ہزار ہا تحائف رشوت کے طور پر لے کر آتی ہو۔ وہ ملکی صنعت کو پروان چڑھتا کیسے دیکھ سکتے ہیں۔

کتنے انجان ہیں اور کس سادگی سے پوچھتے ہیں
کیا میری کسی بات پہ رونا آیا؟

حضرات گرامی!

آخر میں اپنے خیالات کی دنیا کو کچھ اس طرح سمیٹتا ہوں کہ میرے ملک کی ترقی کا دارومدار یقیناً سائنس کی تعلیم و ترویج پر ہے البتہ سائنسی لائن کو اختیار کر کے ترقی کی راہ پر چلنے کے لئے خود آگے بڑھو، اٹھو اور دنیا کی تاریخ میں اپنے ملک کو تابندہ ستارہ بنا ڈالو۔ اس کی صبحوں کو نئی درخشندگی بخش دو۔

دشت طلب میں تنہا نکلو یا پھر اس کے ساتھ چلو
جس کی ٹھوکر راہ نکالے راہ میں ٹھوکر کھائے کم

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت

صاحب صدر!

عجیب فلسفہ ہے کہ ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت'' کس دل کی بات کرتے ہیں۔ جس کی حیثیت ایک قطرہ خون اور گوشت کے لوتھڑے سے بڑھ کر نہیں ہے۔ جو کبھی آنسوؤں میں پڑا ملتا ہے یا کسی کی خاک پا کو چھانتا پھرتا نظر آتا ہے یا آپ کسی ایسے دل کی بات تو نہیں کر رہے جس پر کسی کو اختیار ہی نہیں۔ چاہے تو چند غمزوں اور نخروں پر اپنی دنیا لٹادے یا کسی کالے کلوٹے پر آ جائے تو برس ہا برس مجنوں کی طرح صحراؤں کی خاک چھانتا پھرے۔ محبوبوں کی جفا میں اس کی موت۔ محبوبوں کی ادا میں اس کی موت۔ مشینوں کی حکومت میں اس کی موت۔ دل ہے کہ موت کے بھنور میں پھنستا ہی چلا جا رہا ہے اور جس کے چاروں طرف موت کے بادل منڈلا رہے ہیں زندگی کی رعنائیاں اس کے مقدر ہی میں نہیں اگر کسی ایسے ہی دل کو لئے بیٹھے ہیں تو ہم باز آئے ایسے دل سے۔ مجھے کہنے دیجئے۔

دینے والے نے ایسا دل دے کر
ہم غریبوں سے دل لگی کی ہے

صدر گرامی!

حیرانگی کی بات تو یہ ہے کہ ہر شاعر اور ادیب و راہبر کی زبان پر دل کا رونا ہے۔ حتیٰ کہ میرے محلے کا نتھو کنجڑا بھی دل کے ہاتھوں بڑا مجبور نظر آتا ہے۔ کل کہہ رہا تھا صاحب جی کیا کریں۔

شہر میں لگتا نہیں صحرا سے گھبرائے ہے دل
اب کہاں لے جا کر بٹھیں ایسے دیوانے کو ہم

چلئے ہم آپ کی دلجوئی کے لئے مان لیتے ہیں کہ" ہے دل کے لئے موت مشینوں کی

حکومت'' لیکن خدارا ذرا اپنے گریباں میں جھانک کر تو دیکھیں آپ کے اعصاب محنت سے گھبرا تو نہیں گئے۔ یاسیت، قنوطیت کی منحوس و مسموم ہوا سے آپ کا دم گھٹنے تو نہیں لگا ہے۔ آپ کہیں احساس کمتری کا شکار تو نہیں ہو گئے۔ آیئے ہم آپ کو دعوت دیتے ہیں۔ غور و فکر کی فہم و تدبر کی۔ سوچوں کے دریچے کھولنے کی۔ کیا آپ 25 ہزار سال پہلے کے انسان کی طرح آج کے انسانوں کو پھر غاروں میں دھکیلنا تو نہیں چاہتے۔ جو حلال و حرام کی تمیز کئے بغیر جانوروں کو پتھر مار مار کر ہلاک کرتا اور ان سے اپنے پیٹ کے جہنم کو بھرتا تھا۔ نہ مکان بنانے کا طریقہ نہ کھیتی باڑی کا سلیقہ جسے اپنا تن ڈھانپنے کا طریقہ بھی معلوم نہ تھا۔ آج وہی انسان مشینوں کی بدولت خلا کو تسخیر کر رہا ہے۔ زمین کا سینہ چیر کر بیش بہا خزانوں سے دنیا کو مالا مال کر رہا ہے۔

حاضرین با تمکین!

اگر دل سے مراد گوشت پوست کا لوتھڑا نہیں بلکہ ایک روحانی طاقت کا سرچشمہ ہے تو پھر بھی یہ مفروضہ غلط اور بے بنیاد ایک مرد مومن کی حیثیت سے میرے دل کا مرکز محبت حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات بابرکات ہے۔ اس منزل پہ آخر کار دل کو چین ملتا ہے۔

ہاں سکون دل جو ملتا ہے تو ملتا ہے یہیں آ کر

جب ایک مشین کو دیکھتا ہوں کہ وہ بلا توسل بغیر تار کے سہارے سینکڑوں میل کی بات سنتی بھی ہے۔ سناتی بھی ہے۔ دیکھتی بھی ہے دکھاتی بھی ہے تو میرے زندہ دل میں ایک بہار سی آ جاتی ہے میں اپنے دل کی زندگی اور زندہ دلی پر فخر کرتا ہوں کہ اس مشین کی بدولت میں گھر بیٹھے مدینے کی گلی میں گھوم لیتا ہوں

حضرات والا کرم!

سائنس کا یہ مشینی دور جوں جوں ترقی کی منازل طے کرتا جاتا ہے ایک بندہ مومن کے دل کو جلا ملتی ہے۔ اس مشینی دور میں خدا کی وحدانیت پر روشن دلائل ایک عقل سلیم رکھنے والے کے سامنے جو آ رہے ہیں۔ ان سے مشام جان ایمان معطر ہو کر رہ جاتے ہیں اور دل

بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا (آل عمران: 191)

ان حقائق سے جاہل وگنوار غاروں کی بے ذوق زندگی بسر کرنے والے کب آشنا تھے۔

عالی جاہ!

میں اختصار کے ساتھ اپنے مافی الضمیر کی تائید میں حقائق آپ کے سامنے رکھتا ہوں ذرہ جائزہ لیجئے

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (آل عمران: 191)

کی دعوت ربانی پر غور کرنے کے لئے مشینوں کی حکومت زیادہ معاون بن سکتی ہے۔ یا غاروں کے پتھر

اَلطَّهَارَةُ شَطْرُ الْاِيْمَان

کی سچائی پر مشینوں کی حکومت دال ہے یا ایک دقیانوسی خاکروب، حقائق ومعانی، علوم و معارف کے سمندر میں غواصی کے لئے مشینوں کی حکومت کا سہارا کیا واقعی دل کی موت کا باعث بنے گا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔

اے ارباب بزم اور میرے فاضل دوستو!

ہوش میں آؤ غور سے سنو! شائد کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

اب اور اس سے زیادہ شرم کی ہو بات کیا بزمی
بشر کی زندگی شرمندگی تھی آج سے پہلے

قوم کی تمام تر امیدیں نوجوان طلبہ سے وابستہ ہیں (۱)

وہی جواں ہے قبیلے کی آنکھ کا تارا
شباب جس کا ہے بے داغ، ضرب ہے کاری
اگر ہو جنگ، تو شیران غاب سے بڑھ کر
اگر ہو صلح، تو رعنا غزال تاتاری

حضرات والا کرم!

یہ دنیا امید سے قائم ہے اور کوئی نہ کوئی امید ہر شخص کے دل کی عمیق گہرائیوں میں کہیں نہ کہیں چھپی چٹکیاں لیتی ہی رہتی ہے۔ اس جہان رنگ و بو کی تمام رعنائیاں اس امید کی مرہون منت ہیں۔ انفرادی امیدوں کی تو کوئی حیثیت نہیں البتہ اجتماعی امیدوں کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور خصوصاً ایسے حالات میں جبکہ ہم عرصہ ساٹھ سال سے صرف امیدوں کے سہارے جی رہے ہیں۔ کبھی اس سے امیدیں وابستہ کر لیں اور کبھی اس سے۔ لیکن ہر بار ایسا ہوا۔

آنکھوں کا نور دل کا اجالا بھی لے اڑے
ہم کو تو اپنے دوست ہی ویران کر گئے

اے صدر گرامی!

نہ جانے ہم کب تک امیدوں کے سہارے جیتے رہتے اور کب تک لوگ ہمارے جذبات سے کھیلتے رہتے۔ مقام شکر ہے کہ آج چند سنجیدہ، ذمہ دار اور مدبر شخصیات نے اپنی حسرتوں، خواہشوں اور تمناؤں کا مرکز قوم کے اس عنصر کو بنایا ہے جس نے کبھی بھی اپنے آباء واسلاف اور رہنماؤں کو مایوس نہیں کیا تحریک پاکستان ہو یا تحریک ختم نبوت، تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ ہو یا کسی جابر و ظالم کے جبر و استبداد سے نجات حاصل کرنے کی تحریک۔

سو بار کر چکا ہے تو امتحان ہمارا

ہم نوجوانوں نے ہر آواز پر لبیک کہا ہے۔ سینہ سپر ہوئے ہیں۔ قریہ قریہ، بستی بستی طوفان مصائب و آلام کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے۔ برطانیہ جیسی عظیم سلطنتوں کے فرعونوں کو گھٹنے ٹیکنے پر مجبور کر دیا۔ ناموس رسالت ﷺ کی طرف ناپاک نگاہ اٹھانے والوں کو اپنی ناپاک جسارت کا احساس دلایا اور انہیں جان کے لالے پڑ گئے۔ ہم وطن مقدس پر شب خون مارنے والوں پر برق بن کر گرے اور دوار کا جیسی پناہ گاہوں کو خاکستر کر کے رکھ دیا۔

صدر ذی احتشام!

اگر ہم اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیں تو پتہ چلتا ہے۔ کہ اس کارخانہ قدرت میں مختلف مزاجوں، مختلف میلانوں، مختلف عمروں اور طبقوں سے واسطہ پڑتا ہے یا دوسرے الفاظ میں زندگی کی بساط پر ان گنت مہرے بکھرے ہوئے ہیں جو تعمیر و تخریب کی چالیں چلتے رہتے ہیں۔ ان مہروں میں سب سے مؤثر، ہوشیار چاک و چوبند، ہوش و خرد سے آراستہ، جوش و خروش سے پیراستہ یہی جوان نظر آئیں گے۔ جو مصاف زندگی میں مثبت فتح و کامرانی حاصل کرنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ جن کے مزاج کی تندی، جذبات کی شدت اور اس پر بزرگوں کی نگاہ شفقت درخشندہ مستقبل کو قدموں میں لا کر پھینک دیتی ہے۔

صدر ذی وقار!

یوں تو مستقبل کا انحصار اکابرین سیاست پر ہے۔ مزدور اور کارخانہ دار بھی مستقبل کے لئے امید کے چراغ روشن کرتے رہے۔ علماء دین متین نے جو معاشرے کی اصلاح میں تعلیم و تربیت کا صحیح مرکز ہوا کرتے ہیں۔ قوم کے مستقبل کو سنوارنے کا بیڑہ اٹھاتے رہے۔ والدین پر بھی ذمہ داریاں ڈالی جاتی رہیں۔ لیکن نتیجہ؟......؟ نتیجہ آپکے سامنے ہے...... میرا مقدس ملک سیاست دانوں کے ہاتھوں ٹکڑے ٹکڑے ہوا۔ لیکن ان کی اپنی حالت وہی رہی۔ معیشت و صنعت کے پرخچے اڑے لیکن تاجر و آجر اور مزدور کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ قوم فرقوں میں بٹی، بھائی سے بھائی جدا ہوا، مسجدیں ویران ہوئیں۔ قحبہ خانے آباد

ہوئے لیکن منبع علم وفضل کے جبہ و دستار پر شکن نہ پڑی۔ بچوں کے اخلاق بگڑے، آوارہ ہوئے۔ بڑے بوڑھوں کی پگڑیاں اچھالتے رہے اور ماں فیشن کے نت نئے ڈیزائنوں میں مصروف رہی۔ لتا کے ترنم گانے اس کے کانوں میں رس گھولتے رہے۔ باپ چکی کے پاٹ کی طرح افکار معیشت کے چکروں میں پھنسا رہا۔

چلتے ہیں تھوڑی دور ہر تیز رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

حضرات گرامی!

لے دے کے یہی ایک نوجوان طبقہ رہ جاتا ہے۔ جس کے پاس جینے کی امنگ ہے مستقبل تاریک دیکھتے ہوئے بھی آنکھوں میں عزم کی چمک ہے۔ نیت میں مصلحت کی بجائے خلوص ہے۔ لبوں پر فاتح کی مسکراہٹ ہے۔ عمل میں انقلابی تندی و تیزی ہے۔ اور جن کے ارادے بلند ہیں آج یہی نوجوان جینے کی امنگ آنکھوں کی چمک، خلوص، فاتحانہ مسکراہٹ، انقلابی تندی و تیزی کے ساتھ بلند ارادوں کے ہم آہنگ قوم کو وثوق دلاتے ہیں۔ کہ اگر آپکی مثبت سرپرستی جاری رہی تو ہم قوم کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کے
آئے زمانہ ہمارے ساتھ چلے

قوم کی تمام تر امیدیں نوجوان طلبہ سے وابستہ ہیں (۲)

صدر گرامی قدر!

یہ امر یقیناً درست ہے کہ اگر قوم کو ان نوجوانوں نونہالوں سے امیدیں نہیں ہوں گی تو اور کس سے ہوں گی۔ اور اگر یہی بچے شگفتہ چہرے ملت کے درد کا مداوا نہیں بنیں گے تو کون ہوگا۔ یہی وہ شاداب گلاب ہیں۔ جو چمن ملت کو رشک جناں بنائیں گے۔ ہاں ہاں۔ مجھے کہنے دیجئے کہ یہی وہ چہکتے بلبل ہیں جن کی مترنم آواز میں گائے گئے نغمے پوری ملت اسلامیہ کے لئے راحت کا سامان فراہم کریں گے۔ میرے خیال میں آپ ان بچوں اور میرے ہم عمر ساتھیوں کو یاد دلانا چاہتے ہیں کہ تمہی تو شاہین اقبال ہو۔ تمہی تو نشان منزل ہو۔ تمہی تو میر کارواں ہو اور تمہی تو اس شعر کے مصداق ہو۔

سبق پڑھ پھر صداقت کا، شجاعت کا، عدالت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

حضرات محترم!

یہی وہ نوجوان طلبہ ہیں جنہوں نے ماضی میں ملک و ملت کے لئے عظیم کارنامے سرانجام دیئے۔ ان کا ماضی شاندار ہے بلکہ تابدار ہے۔ یہی وہ ماضی کے درخشندہ ستارے ہیں جنہوں نے قائداعظم کی آواز پر لبیک کہا اور اقبال کے شاہین کی طرح پوری فضاء ایشیا میں ایسے پھیل گئے کہ گاندھی کے ماتھے پر شکنیں پڑ گئیں۔ لے کے رہیں گے پاکستان بن کے رہے گا پاکستان'' کے فلک شگاف نعروں سے حکومت برطانیہ کے ایوان پر لرزہ طاری ہو گیا یہی وہ نوجوان طلبہ تھے جو انگریز کے مضبوط ایوان میں دراڑیں ڈال گئے۔ آپ گزشتہ کسی بھی تحریک کا مطالعہ کریں یہ ہراول دستہ کے طور پر سب سے آگے نظر آئیں گے۔ ان نوجوان طلبہ کی سرشت میں ہمیشہ سے یہ عزم شامل رہا ہے۔ کہ اپنے بزرگوں کو زندگی کے کسی

میدان میں مایوس نہیں کرتے بلکہ انہیں ان کا ہر قدم للکارتا ہے۔ ابھارتا ہے اور کہتا ہے۔

اٹھ باندھ کمر کیوں ڈرتا ہے
پھر دیکھ خدا کیا کرتا ہے

اور جب یہ عزم صمیم کا پیکر بن کر اٹھتے ہیں تو

نظر آتی ہے ان کو اپنی منزل آسمانوں میں

اے صدر محفل دانشوراں!

آپ کے ذہن میں ایک سوال غیر اختیاری طور پر ابھرتا ہو گا کہ ان نوجوانوں کا ماضی اگر اتنا درخشاں ہے۔ تو ان کا حال اتنا گندہ کیوں ہے۔ کہیں ان کی تصویریں بسوں کے شیشے توڑنے' دکانوں کو آگ لگاتے ہوئے اخبارات کی زینت بنتی ہیں۔ کبھی یہ آوارہ منش لوگوں کی صف میں کھڑے نظر آتے ہیں۔ ان کا معیار تعلیم پریشان کن ہوتا جا رہا ہے۔ سیاسی جوڑ توڑ انہی کا مرہون منت، آوارگی ان کا مشن' نعرہ بازی بلکہ ہر قسم کی بازی ان کا شیوہ آخر ایسا کیوں ہے۔ تو میں اپنے نوجوان طلبہ کے جذبات کی ترجمانی کرتے ہوئے مختصراً عرض کرتا ہوں گستاخی معاف

ان چھوٹے سے بچوں میں نہیں کوئی خرابی
ان بچوں کے بوڑھوں کی کوئی چال غلط ہے

ہم سوال کرتے ہیں کہ ہمارے بزرگوں نے پاکستان حاصل کیا تو کیا اس کو سنبھالا کیا مقصد پاکستان لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کے مطابق اس کو ڈھالا میرے مقدس ملک کے ایوان میں بیٹھنے والے رہنماؤں کی اکثریت آج تک جو کچھ کرتی رہی ہے کیا اس کے مطالعہ سے سر ندامت سے جھک نہیں جاتا ہاں ہاں مجھے کہنے دیجئے۔

راہزنوں سے آج تک نہ ہو سکا
جو ہمارے رہنما کرتے رہے

اے اس عظیم ایوان میں بیٹھنے والے عظیم تر لوگو!

نوجوان طلبہ سے امیدیں وابستہ کرنے والے بزرگو! میرے ان جذبات کے بہتے ہوئے دھاروں سے آپ خفا نہ ہوں۔ بات آپ کی نہیں زمانے کی ہے۔

جفا کے ذکر پہ کیوں سنبھل کے بیٹھ گئے
بات تمہاری نہیں زمانے کی ہے

تاہم آج کا نوجوان اپنے ماضی کی طرح آج بھی اپنے بزرگوں کو مایوس نہیں کرے گا آپ راہیں متعین کرتے جایئے مشعلیں روشن کرتے جایئے۔ شجاعت کی' عدالت کی پھر یقیناً آپ دیکھیں گے کہ ہم نے اپنے آپ کو اس کا اہل بنا دیا ہے کہ

لیا جائے گا ہم سے کام دنیا کی امامت کا

قوم کی تمام تر امیدیں نو جوان طلباء سے وابستہ ہیں (۳)

عظیم صدر بالا قدر!

ہر قوم اپنے نو جوان طلباء سے امیدیں وابستہ کرنے میں حق بجانب ہے کیوں کہ مستقبل کو سنبھالنے کی عظیم تر ذمہ داری اس نو جوان نسل پر ہے۔ کل کو قوم کی نیا کے کھیون ہار یہی ہوں گے۔ جب سے انسانیت نے شعور کی آنکھ کھولی ہے۔ اس وقت سے ہر ڈوبتی' ابھرتی' بگڑتی' الجھتی' پریشان حال، نا آشنا صبر وشکیب اور واقف اضطرار واضطراب قوتوں کو سہارا دینے والے اطمینان وسکون کی دولت سے مالا مال کرنے والے اور عصاء موسوی بن کر قعر غلامی سے نکالنے والے ہمارے جملہ اسلاف بھی تو آخر پہلے نو جوان ہی تھے۔ انہوں نے اپنی جوانی ہی کے عالم میں اپنی قوم کے درد کی ٹیسیں محسوس کیں۔ تلملائے، تڑپے پھر یہی تلملاہٹ، یہی تڑپ ہمیشہ آگے بڑھتی رہی اور قوموں کی زندگیوں کو انقلاب سے آشنا کرتی رہی۔

بشر بے چین ہو تو انقلاب آیا ہی کرتا ہے
گلوں کے داغ دھونے کو سحاب آیا ہی کرتا ہے
پرانے ساغروں میں جب کھنک باقی نہیں رہتی
تو گردش میں نیا جام شراب آیا ہی کرتا ہے

اے مسند صدارت کو رونق بخشنے والے صدر ذی وقار!

اگر آج میری قوم نے ایک طویل تر غفلت و بے حسی کی نیند سے انگڑائی لی ہے اور بیدار ہو کر سوتے میں مار ہائے آستینوں کے ڈسے ہوئے زہر کو محسوس کر لیا ہے اگر میری قوم کا احساس زیاں جوان ہو گیا ہے اور اس نے محسوس کر لیا ہے کہ اب ماضی پر کف افسوس ملنے کی بجائے حال اور مستقبل کو تابناک بنانا ہے اور اس عظیم مقصد کے لئے اپنے نو جوان طلباء

سے امیدیں وابستہ کرلی ہیں تو

سرِ تسلیم خم ہے جو مزاجِ یار میں آئے

میری گزارشات کو گوش ہوش سے سننے والے حاضرین باتمکین!

میں آپ سے سوال کرتا ہوں کہ جو درخت پھل کھانے کے لئے لگایا جائے یا جس کے سائے میں سورج کی چلچلاتی دھوپ سے بچنا مقصود ہو، کیا اس کی پرورش جھاڑ پھونس کی طرح کی جاتی ہے۔ اگر کوئی باغبان جنگلی خودرو بوٹیوں پر قیاس کر کے چمن کو رشک جنت بنانے والے پودوں کو نظر انداز کر دے اور پھر یہ امید رکھے کہ یہ پودے کل میرے مشام جاں کو معطر کریں گے تو ایسے باغبان کے دماغ کا کوئی نہ کوئی پرزہ ضرور ڈھیلا ہے۔

حضرات گرامی!

کیا ماضی میں ایسا نہیں ہوا اور اب بھی ایسا نہیں ہو رہا کہ والدین بچوں کو سکول بھیج کر یوں مطمئن ہو جاتے ہیں جیسے کوئی شخص لیٹر بکس میں خط ڈال کر مطمئن ہو جاتا ہے کہ بس اب یہ پہنچ جائے گا۔ اور کیا نظام تعلیم نے آج تک ایسے لوگ نہیں پیدا کئے جو معاشرے کے کلرک بادشاہ کی حیثیت سے پہچانے جاتے ہیں۔ کیا ذرائع ابلاغ عامہ نے نوجوان نسل کو خنساء کی صف میں لا کر کھڑا نہیں کر دیا۔

کیا ایسا نہیں ہوا کہ پوری قوم کو مرض کرکٹیریا میں مبتلا کر دیا گیا ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہے اور یقیناً ہے تو ذرا سوچیں جن شاہینوں کو آپ ساٹھ سال سے خاکبازی کا سبق دے رہے ہیں۔ ان نوجوانوں سے اچانک عقابی صفات کی امیدیں وابستہ کرنے میں آپ کہاں تک حق بجانب ہیں۔

آپ ہی اپنی اداؤں پہ ذرا غور کریں
ہم اگر عرض کریں گے تو شکایت ہو گی

صدر ذی وقار!

لوگ کہتے ہیں تو پھر ٹھیک ہی کہتے ہوں گے کہ صبح کا بھولا شام کو گھر لوٹ آئے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ اگر آپ نے اور پوری قوم نے ہم نوجوان طلباء سے اپنی تمام تر امیدیں وابستہ کر لی ہیں تو ہم اپنے محسنوں اور بزرگوں کو کبھی مایوس نہیں کریں گے۔ اگر ہم ماضی میں اپنے ملک وملت کے لئے ہر پکار پر لبیک کہتے ہوئے ہر پلیٹ فارم پر سرخرد ہو چکے ہیں تو یقیناً ہم اپنے وطن وملت پر آئندہ بھی جاں تک کی بازی لگا دیں گے۔

اے میرے وطن کی مقدس ہواؤ! میرے ملک میں بہنے والے دریاؤ اور سمندروں کی عظیم لہرو! اے میرے وطن کی حفاظت کی خاطر سرحدوں پر جان ہتھیلی پر رکھ کر بیٹھنے والے مجاہدو اور اس ایوان میں نوجوان طلباء سے امیدیں وابستہ کرنے والو گواہ رہنا!!

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلا دیں گے
چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

سپاہی کی ساری زندگی جہاد ہے

ہم رن کو چوم لیتے ہیں تڑپ کردار پر
یہ غلامان محمد ﷺ کی پرانی رسم ہے

صدر ذیشان اور محفل دانشوراں!

اگر سوچا جائے تو مسلمان بحیثیت مسلمان ہر آن سپاہی ہے۔ سپاہی ایک جہد مسلسل کا نام ہے اور ''مرد حر کے لئے نہیں ہے جہاں میں فراغ'' کے مصداق سن شعور کی وادی میں قدم رکھتے ہی سپاہیانہ تگ ودو کا آغاز ہو جاتا ہے۔

اس کی ماں کی لوریاں اس کے کانوں میں مادر وطن کے گیت سناتی ہیں۔ اس کی مقدس ماں کے لبوں کا لمس صبح آزادی کی ٹھنڈک بھرتا ہے۔ اس کے بوسے خاک وطن سے اس کی مانگ بھرنے کے لئے اس کی جبیں کو بزدلی کے داغ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صاف کر دیتے ہیں۔ اس کا باپ اس کی رگوں میں مادر وطن اور شمع دین مصطفیٰ ﷺ پہ قربان ہونے والے خون سے اسے شعلہ جوالہ بنا دیتا ہے۔

یہ اٹھتا ہے تو اس کی ہر اٹھان میں محمد عربی ﷺ کی محبت کا جوش اٹھتا ہے۔ اور اگر بیٹھتا ہے تو اس کی ہر بیٹھک رب محمد ﷺ کے حضور ہوتی ہے۔ غرض آج کے اس ایوان میں مجھے جس موضوع کو الفاظ ومعانی کے پیرہن میں سجانا ہے اس کے متعلق میرے سامنے خیالات کا ایک ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجزن ہے۔ لیکن اس مشینی دور کی پیداوار یہ کال بیل، یہ گھنٹی وقت کی قلت کا احساس دلانے کے بہانے میرے جذبات واحساسات کی قاتل بن جاتی ہے۔

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات

حضرات گرامی!

یہی وہ جذبہ عمل ہے۔ جو سپاہی کی زندگی کے روز ازل ہی سے ہر سانس اور ہر لمحے پر محیط ہوتا ہے۔ وہ لمحہ اجتماعی ہو یا انفرادی، تعمیر مملکت ہو یا تحفظ آزادی، مقام تربیت ہو یا جنگ کا میدان، میدان لہو ترنگ ہو یا میدان حرب کا ڈھنگ، طرز گفتگو ہو یا خوئے عبادت، نماز کی شیرینی ہو یا منظر جہاں بینی، مکتب کا تقدس ہو یا بزرگوں کا احترام، ڈیوٹی کی شب ہو یا پیشے کا ڈھب ہو، کام کی رفتار ہو یا اوصاف کردار، جنبش قلم ہو یا طاقت تلوار، اغیار کے چکر ہوں یا ظالم سے ٹکر، غرض مجاہد ہر لمحہ جہد مسلسل کا امین ہے۔

اے مسند نشین صدارت!

ایک طرف مادر وطن کی محبت کا امین ہو کر نفرتوں کے اس جہان کو اپنی محبت کی عطر بیزیوں سے معطر و مطہر کرتا ہے۔ تو دوسری طرف اپنی ناتواں ہڈیوں میں ایمان کا چونا ملا کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاتا ہے۔ ایک طرف امن ہو یا جنگ ظلم و ستم کی آندھی میں اور شر و بدی کی یلغار میں پوری دنیا کی مسلم برادری کے لئے دکھ درد کا چارہ بنتا ہے۔ تو دوسری طرف وہ آنکھ جو غائبانہ اٹھتی ہے اور وہ ہاتھ جو ظالمانہ بڑھتا ہے۔ وہ آنکھ پھوڑتا ہوا۔ وہ ہاتھ توڑتا ہوا کلمہ طیب لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پڑھتا ہوا دشمنوں کے دانت کھٹے کر دیتا ہے۔ اور اس عزم کا اظہار کرتا ہے۔

یزیدی دور سیاست لپیٹا جائے گا
صدا حسین کی گونجے گی رہبر بن کر
وہ اور کشتیاں ہوں گی ڈبو دیا جن کو
ہماری راہ میں آنا کبھی بھنور بن کر

سپاہی اس عزم کی پختگی کے ساتھ ملک کی نظریاتی، بری،، بحری اور فضائی سرحدوں کے دفاع کی خاطر خالد کی تلوار بن کر، محمد بن قاسم کی للکار بن کر، دشمن پر ٹوٹ پڑتا اس کی جھپٹ میں غزنوی کی سرعت، سعد بن وقاص کی تڑپ اور ایم ایم عالم کی ہمت ہوتی ہے۔ اس کے

جوش میں ہوش کا دامن سایہ فگن ہوتا ہے وہ کمین دشمن کی طرح بچوں، بوڑھوں، عورتوں اور فصلوں کے لئے طوفان باد و باراں نہیں بلکہ محمد عربی ﷺ کے دامن رحمت کو پھیلا کر فصلوں پر ابر رحمت بن کر برستا ہے۔ عورتوں کے لئے امن کی چادر بنتا ہے اور بوڑھوں کا سہارا بنتا ہے۔

راہ وفا میں ہر سو کانٹے دھوپ زیادہ سائے کم
لیکن اس پر چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم

جناب مکرم!

میں اپنے خیالات کی دنیا کو سمیٹتے ہوئے کہنا چاہوں گا وطن کا سپاہی واقعۃً ہر لمحہ جہاد میں مصروف عمل ہوتا ہے۔ اس کی رات کے خواب ہوں یا صبح صادق کے وقت اذان سحر ہو۔ اس کا اپنے حضور سجدہ ریزی کا مقدس لمحہ ہو یا مضبوط توانا ہاتھوں کی گرفت کا عاجزانہ بارگاہ الٰہی میں پھیل جانا۔ اپنی سپاہیانہ وردی میں ملبوس چاک و چوبند ہو۔ یا چپ و راست قدم کی ضرب سے زمین کا سینہ ہلا دینے کا انداز ہو۔ بہر صورت، بہر لمحہ اور بہر انداز وہ سپاہی مجاہد ہے۔ اس کی سوچوں کا محور جہاد، اس کے خیالات کی اٹھان جہاد، اس کی فکر کی پہنچ جہاد، غرض اس کا لمحہ جہاد ہے۔ اس کا اوڑھنا اس کا بچھونا، اس کا کھانا، اس کا پینا، اس کا سونا اور جاگنا سب کچھ ہمہ وقت اور ہر لمحہ اس کی زندگی جہاد سے عبارت ہوتی ہے۔

اے مرد مجاہد جاگ ذرا اب وقت شہادت ہے آیا

بچے قوم کے معمار ہیں

صدر ذیشان اور ارباب باوقار!

میں چونکہ ابھی ایک چھوٹا سا بچہ ہوں اور عقل و شعور کا بھی کچا ہوں۔ اور آپ ماشاء اللہ عقیل، فہیم، متین اور خلیق ہیں۔ اس لئے میری کسی کج فہمی یا خوش فہمی کو نشانہ مذاق و طنز بنانا آپ کی شان کے خلاف ہے۔ دراصل جب میں نے آج کے موضوع کو پہلی مرتبہ سنا تو سمجھا کہ موضوع ہے "بچے قوم کے بیمار ہیں" یہ موضوع باعث حیرت بھی تھا اور مسرت کا سامان بھی۔ حیرانگی کی وجہ یہ تھی کہ یا اللہ پاکستان نیشنل سنٹر والوں کو خودستائی اور تن پروری کے اس دور کے اندھیر میں کیا سوجھی۔ اور یہ کب سے حکیم اور ڈاکٹر اور نباض ٹھہرے۔ پھر اس تقریب کے صدر جناب قیوم نظر صاحب بھی ادیب لوگ ہیں اور ادیب لوگ تو عاشق مزاج ہوتے ہیں۔ جبکہ عشق بیچارہ نہ زاہد ہے نہ ملا نہ حکیم۔ آخر قوم کے بچوں کے بیمار ہونے کی انہیں کیوں کر فکر لاحق ہوگئی اور اگر یہ سربستر راز ان پر منکشف ہو ہی گیا ہے کہ بچے قوم کے بیمار ہیں تو یہ لوگ کر بھی کیا سکتے ہیں۔

عالی جاہ!

اور یہ موضوع مسرت کا سامان اس لئے ہوا کہ میں بحیثیت بچہ قوم، حقیقتاً جسمانی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی طور پر بیمار بھی ہوں بلکہ مریض الامت ہوں۔ الحمدللہ کوئی تو دانائے راز سامنے آیا۔ کسی نے تو میرے درد کو سمجھا۔ واقعی

بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

اے مسند صدارت کی رونق!

ابھی انہی حسین تصورات اور خوش آئند جذبات کی دنیا میں گم تھا کہ میرے استاذ محترم نے موضوع دوبارہ پڑھا تو پتہ چلا کہ لفظ بیمار نہیں معمار ہے۔ میں نے اپنے ساتھی سے

پوچھا۔ یار معمار کیا ہوتا ہے۔ اس نے بالکل آسان لفظوں میں مجھے بتایا کہ معمار تعمیر کرنے والے اور بنانے والے کو کہتے ہیں یعنی بچے قوم کے بنانے والے ہیں۔ قوم کے معمار کا لفظ سنتے ہی مجھے میرے گھر، میرے ملک، میرے وطن پاکستان کا صدر دروازہ بنانے والا معمار یاد آ گیا۔ جس نے میرے گھر کے تمام افراد کو ساتھ ملا کر بنایا تھا۔ اس نے اس کے بنانے میں اپنی تمام تر صلاحیتیں صرف کر دی تھیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ دروازہ میرے آباء کی ہزاروں تمناؤں اور آرزوؤں کا محور تھا۔ اڑوس پڑوس اور کچھ گھر والوں نے اس عظیم اور مقدس کام میں بڑے روڑے، اٹکائے تھے۔ لیکن اس نے بننا تھا اور وہ بن کر رہا۔ میرے بزرگ اس کے حسن و جمال میں ایسے کھو گئے یا تھک کر ایسے سو گئے کہ اپنی منزل ہی کھو بیٹھے۔ یار لوگوں کا داؤ چل گیا۔ انہوں نے شبخون مارا۔ میرے گھر کے دروازے کا ایک پاٹ اکھاڑ کر پھینک دیا۔ اس کے پرخچے اڑا دیئے اور اٹھا کر میرے پڑوسی دشمن کے حوالے کر دیا۔ وہ ابھی تک اس کے پاس ہے۔ معمار اول کہیں جا چکا ہے۔ اس لئے اس کو دوبارہ تعمیر کرنے کی کسی کو فکر لاحق نہیں ہوئی۔ ادھر ظالم دشمن پڑوسی کا یہ حال ہے کہ مجھے جلانے کے لئے اس توڑے ہوئے دروازے کا کوئی نہ کوئی حصہ لیتا ہے اور اسے آگ دکھاتا رہتا ہے۔ میرے بزرگ تا حال باقی ماندہ دروازہ کے حسن و جمال میں گم ہیں۔ سوچتا ہوں اور یہ سوچ مجھے ہر آن ڈستی بھی رہتی ہے۔ خاکم بدہن! کہ کہیں وہ میرے گھر کے دروازے کے دوسرے حصے کو بھی اچک کر نہ لے جائیں۔

برا نہ مان ذرا آزما کے دیکھ اسے
خدا کرے تجھے تیرے مقام سے آگاہ

جناب صدر!

معذرت چاہتا ہوں۔ مسئلہ تو تھا میرے گھر کا۔ پیش کر دیا آپ کے سامنے۔ جس کیلئے آپ سے معذرت مطلوب ہے۔ لیکن خدارا یہ تو بتاؤ۔ وہ پرانے معمار کیا ہوئے۔ وہ ہم سے کیوں منہ موڑ گئے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے۔ جیسے آپ میں سے کئی لوگ اس معمار اول

کے ہم سفر' ہمراز اور ہم رکاب تھے۔ خدارا جاؤ اور انہیں بلا لاؤ۔ وہ میرے گھر کے دروازے کی از سرِ نو تعمیر کر جائیں۔ لیکن مجھے یقین ہے آپ میں سے کوئی بھی اس کے سامنے نہیں جا سکے گا۔ ہاں ہاں۔ اگر گئے بھی تو کیا منہ لے کر جاؤ گے۔ تم نے تو الٹا اپنے سر سے بوجھ اتارا ہے اور ہم بچوں، عقل کے کچوں کو یہ سبق دیا ہے کہ بھولوان معماروں کو اور چھوڑ دو ہم مسماروں کو۔ اب معماری کے فرائض تم ادا کرو۔ کہ اس دور میں بچے ہی قوم کے معمار ہیں۔

قم باذن اللہ جو کہہ سکتے تھے وہ سب رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گور کن

اے میرے گھر۔ اے میرے وطن' میرے پاکستان کی فضاؤ۔ مقدس ہواؤ۔ گواہ رہنا' تیرے سپوتوں نے یہ بار ہم بچوں پہ لا ڈالا ہے۔ ہمیں یہ اعزاز بخشا ہے۔ سر تسلیم خم ہے جو مزاج یار میں آئے۔ ہم تیرے دروازے کی از سرِ نو تعمیر کریں گے اور وہ مکار دشمن جس نے تیرے حصے بخرے کئے ہیں۔ ہم اس پر خالد کی تلوار بن کر۔ ابن قاسم کی للکار بن کر ٹوٹ پڑیں گے۔ ہماری ہر جھپٹ میں غزنوی سرعت ہوگی۔ سعد بن وقاص کی تڑپ ہوگی۔ ایم ایم عالم کی ہمت و پھرتی ہوگی۔ ہمارے جوش پر ہوش کا دامن سایہ فگن ہوگا اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی رحمت ہوگی۔ پھر ...... پھر

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلا دیں گے
چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

سپہ گری ایک عظیم پیشہ اور فن

نشیمن پر نشیمن اس طرح تعمیر کرتا جا
کہ گرتے گرتے خود ہی بجلیاں بیزار ہو جائیں

اے صدر باوقار اور حاضرین باتمکین!

آسمانوں کی وسعتوں کو چھونے والے، پہاڑوں کے سینے چیرنے والے، سمندروں کی گہرائیوں میں اترنے والے، خلاؤں اور فضاؤں پر چھا جانے والے، مادر گیتی کے رکھوالے، عزت وشہرت والے آخر کون ہیں؟

حضرات بتائیے!

وہ کون ہیں جن کے جذبے جواں ہیں جو دشمنوں کے مقابلہ میں آہنی دیوار بن جاتے ہیں۔ انہیں کس نام سے پکاریں کہ جن کا عزم وثبات پہاڑوں کو سر کرتا دکھائی دیتا ہے اور جن کا ایک ایک لمحہ اور ایک ایک سانس اپنے وطن کی بقاء کے لئے وقف ہے۔ جن کی زبان حال یہ کہتے سنائی دیتی ہے۔

پاک دھرتی کے متوالے کہلائیں گے
اس کے پرچم کو دنیا میں لہرائیں گے
چپے چپے کو محفوظ رکھیں گے ہم
دشمنوں کی کمر توڑ ڈالیں گے ہم

یہ وہی متوالے ہیں جو سپہ گری کے عظیم الشان پیشہ اور فن کے امین ہیں۔ سپہ گری ایک ایسا عظیم پیشہ اور فن ہے کہ جس سے باوقار اور باعزت لوگوں کے عزائم بلند اور حوصلے جواں ہیں۔ یہ پیشہ اختیار کرنے والے جرأت وہمت اور شجاعت کا منہ بولتا ثبوت ہوتے ہیں۔ جو حب الوطنی کے جذبے سے سرشار اپنی جہد مسلسل کے بل بوتے پر تاریخ کے اوراق پر اپنا

نام اور مقام پیدا کر جاتے ہیں۔

حضرات محترم!

سپہ گری ایک عظیم الشان فن ہے اور سپہ گری ایک باوقار پیشہ ہے۔ سپہ گری پیشہ ہے نبی آخر الزمان ﷺ کا۔ یہی وہ فن ہے جس کے ذریعے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ، حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ' محمد بن قاسم رحمۃ اللہ علیہ' محمود غزنوی رحمۃ اللہ علیہ نے کفار کو پے درپے شکستیں دے کر ملت اسلامیہ کا سر فخر سے بلند کر دیا۔

سپہ گری ایک ایسا پیشہ ہے جو ہمیں دوسرے پیشوں سے نمایاں کرتا ہے۔ یہ پیشہ ایک مشن ہے حضور رحمت عالم ﷺ کا۔ سپہ گری ایک عبادت ہے اور عبادت رب کریم کو پسند ہے۔ سپہ گری جہاد ہے یہی وہ جہاد ہے جو رسول مقبول ﷺ نے فرمایا۔ یہی وہ جہاد ہے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور اسلاف نے کیا یہی وہ جہاد ہے جو حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا میں اپنے 72 جاں نثاروں کی قربانی دے کر کیا۔

قتل حسین رضی اللہ عنہ اصل میں مرگ یزید ہے
اسلام زندہ ہوتا ہے ہر کربلا کے بعد

سپہ گری ایک پیشہ وفن ہی نہیں بلکہ سپہ گری ایک شان ہے سپہ گری ایک آن ہے۔ سپہ گری ہمارا ایمان ہے۔ سپہ گری روح قرآن ہے۔ سپاہ گری ایک عبادت ہے۔ آئیے ہم اپنے آقا و مولا ﷺ پر نازل ہونے والی آخری کتاب قرآن مجید فرقان حمید پر نظر دوڑائیں۔ جس میں واضح الفاظ میں فرمایا گیا۔

وَجَاهِدُوْا فِىْ سَبِيْلِهٖ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ۝ (المائدہ)

''یعنی اور اس کی راہ میں جہاد کرو تا کہ تم کامیاب ہوسکو''۔

اور فرمایا:

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ۝ (بقرہ)

''یعنی جو اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے مر جائیں انہیں مردہ نہ کہو بلکہ زندہ ہیں۔ لیکن تمہیں ان کی زندگی کا شعور نہیں''۔

صدر ذی شان!

آیئے۔ ذرا اپنے ماضی پر نگاہ ڈالیں ہمارے اسلاف، مجاہدین سپاہ گروں نے جنہوں نے اپنے بے مثال جذبہ ایثار اور کردار شجاعانہ سے ثابت کر دیا کہ وہ ایسے سپوت ہیں جنہوں نے مادر گیتی اور وطن عزیز کے باسیوں کو جینا سکھایا اس پیشہ نے انہیں اس قابل بنایا ہے کہ دشمن کی نیندیں حرام ہو گئی ہیں۔

ہم رشک کرتے ہیں ان مجاہدوں پر اور ان جیالوں کو سلام کرتے ہیں اور ان کی عظموں پہ رشک کرتے ہیں اور ہم انہیں ہر سانس یاد کرتے ہیں۔ جنہوں نے اس پیشہ کی روایات کو برقرار رکھتے ہوئے اپنی جان پر کھیل کر ثابت کر دیا کہ ان کے مقاصد عظیم ہیں ان کا پیشہ عظیم تر ہے۔ جو خود تو وطن کی آن پر وطن کی شان پر اور شوکت پر قربان ہو گئے۔ لیکن اپنے پیچھے نہ بھولنے والی یادیں چھوڑ گئے ہم ان کی عظمتوں کو سلام کرتے ہیں۔

حکمت و تدبر سے یہ فتنۂ آشوب خیز
ٹل نہیں سکتا و قد کنتم بہ تستعجلون

سپاہ گری اعلیٰ اقدار زندگی کو فروغ دیتی ہے

صدر گرامی اور ارباب محفل!

مجھے آج جس موضوع پر گفتگو کا اعزاز ملا ہے اگر اس کے لغوی معنے پر غور و فکر کیا جائے تو سپاہ گری بذات خود سوائے سپاہیانہ کردار اور بہادری کے کوئی اہمیت نہیں رکھتا اگرچہ سپاہیانہ انداز فکر اور بہادری بھی عظیم اور قابل فخر پیشہ ہے۔ لیکن اگر ہم بحیثیت بندۂ مومن اس کی اہمیت پر نظر ڈالتے ہیں تو اس انداز زندگی میں زندگی کے تمام شعبوں کی رفعتیں سپاہی کے قدموں میں ڈھیر ہو جاتی ہیں۔ حکیم الامت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے انہی اقدار عظیمہ کو پیش نظر رکھتے ہوئے دونوں میں فرق واضح کیا ہے۔

جنگ مومن سنت پیغمبر است
جنگ کافر فتنہ و غارت گری است

صفت مومن سے نا آشنا سپاہی فتنہ گر ہے۔ غارت پیشہ ہے اور درندہ صفت حیوان ناطق ہے۔ وہ اعلیٰ اقدار کے فروغ کا باعث نہیں بن سکتا اور اگر سپاہ گری جذبہ ایمان کی حامل ہے۔ تو واقعی زندگی کی اعلیٰ اقدار کو فروغ دینے کی ضامن ہے۔ ہم اس دعوے کے ثبوت میں تاریخ اسلاف، مجاہدین اسلام اور دنیا کے عظیم سپہ سالاروں کو زیب موضوع بنا سکتے ہیں۔

خدائے واحد اور محمد عربی ﷺ کی ذات ستودہ صفات پر دل کی عمیق گہرائیوں سے ایمان اور یقین کی پختگی سپاہی کو یک گونہ طمانیت و سکون کی دولت عطا کرتی ہے۔ اپنے فرائض منصبی کو ادا کرتے ہوئے اس فرض کا تقدس سپاہی کو فتح و شکست سے بے نیاز کر دیتا ہے اور جان کی بازی لگا دینے کو تنخواہ کا صلہ نہیں سمجھتا بلکہ جان آفرین کے حضور جاں سپردگی کے نشے سے سرشار نظر آتا ہے۔ اور جان دینے کے باوجود اس کا جی نہیں بھرتا اور حسرت و

افسوس سے بے ساختہ پکار اٹھتا ہے۔

جان دی دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہو

حضرات محترم!

اب آخر میں عرض مدعا پیش کرتے ہوئے کہنا چاہوں گا کہ یہی وہ جذبہ ہے جس سے انداز حیات میں حیات نو کی لہر دوڑ جاتی ہے۔ زندگی با مقصد معلوم ہوتی ہے۔ اپنی جان کے لئے تو جانور بھی دفاع کرتا ہے۔ لیکن قوم' وطن' دین' مذہب' اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول ﷺ کے لئے زندہ رہنا۔ زندگی کے لئے دفاع کرنا۔ اس دفاع میں جان کی بازی لگانا۔ پھر فتح ونصرت سے کامیاب لوٹنا یا پھر اپنی جان کی بازی لگا کر جام شہادت نوش کر لینا ہر طرح انسانی عظمت کی معراج ہے۔ یہی معراج اقدار زندگی کو فروغ دیتی ہے۔

عقل بڑی کہ بھینس؟
(منفی خیالات)

حضرات محترم!

مجھ سے پیشتر ایک صاحب بڑے جوش کے ساتھ عقل کی بڑائی کا لوہا منوار ہے تھے۔ ان کی گفتگو میں جوش تھا' شور تھا اور ہنگامہ تھا۔ حالانکہ اگر واقعی ان کے پاس عقل ہوتی اور اس عقل سے کام لیتے اور عقل خود ان سے مخاطب ہو کر کہتی کہ میری بڑائی کا اظہار کرنے والے ذرا سامنے دیکھ وہ بھینس کھڑی ہے۔ دیدے پھاڑ پھاڑ کر دیکھ۔ اور ایک بار پھر دیکھ اور فیصلہ کر کہ عقل بڑی ہے کہ بھینس؟ اور ایسے میں' میں بھی کہتا کہ مجھے اندھا اور حاوج کا طعنہ دینے والے اتنی بڑی کالی کلوٹی بھینس تمہیں چھوٹی نظر آتی ہے۔

بار خدا!

اس دنیا کو کیا ہو گیا ہے۔ اس عقل کو بڑا کہہ رہے ہیں۔ جس کا کوئی وجود ہی نہیں۔ نہ جسم' نہ جثہ اور نہ ہیولا اور سامنے دس پندرہ من کی زندہ حقیقت کھڑی ہے۔ پھر بھی کتنی ڈھٹائی سے کہے جا رہے ہیں کہ بھینس نہیں عقل بڑی ہے

حضرات محترم!

دنیا میں ہر وہ لفظ جو عین سے شروع ہوتا ہے۔ مثلاً عقل' عشق اور عورت وغیرہ انسان کے ازل سے دشمن ہیں۔ دنیا میں سب سے پہلے شیطان نے اللہ تعالیٰ کے سامنے عقل سے کام لیتے ہوئے عظمت انسانیت کو سجدہ کرنے کی تاویلات پیش کیں اور دھتکار دیا گیا فرہاد نے عشق کے ہاتھوں مجبور ہو کر ساری زندگی پہاڑ کھودنے میں گزار دی کس کام آئی وہ زندگی۔ بڑائی تو اس بھینس کی ہے جو ابتداء سے انتہا تک کام آتی ہے۔

صدر ذی احترام!

بڑائی تین طرح کی ہوتی ہے کام کی بڑائی' جسم کی بڑائی اور نام کی بڑائی آج کے موضوع پر تینوں اعتبار سے گفتگو کر کے دیکھ لیتے ہیں کہ بھینس کس اعتبار سے بڑی ہے عقل کے پاس سوچ اور فکر کے سوا ہے ہی کیا۔ پنجابی میں کہتے ہیں'' سوچیں پیا تے بندہ گیا'' لہٰذا ہر وقت سوچتے رہنا کسی فکر میں گم سم رہنا کوئی کام نہ ہوا بھینس کو دیکھو بچپن سے بڑھاپے تک زندگی کا کوئی لمحہ بے کار نہیں رہتی کام کرتی بھی ہے کام آتی بھی ہے۔ اے عقل کے پرستارو! جب تم چھوٹے تھے۔ بھوک پیاس سے تمہاری بلبلاہٹ محلہ داروں کی نیندیں حرام کر رہی تھی اس وقت سے اب تک بھینس تمہارے کام آ رہی ہے۔ سوچو! دعوے، دلیلیں اور فکر بڑے ہوتے ہیں کہ کام، گھی، مکھن، چھاچھ، گوشت، چمڑے، ہڈیاں ہر چیز اس کی کام میں لاتے ہو اور پھر بھی کہتے ہو۔ عقل بڑی ہے۔ واہ عقل والو! تمہاری عقل کو سلام

صدر ذیشان!

پھر جسم کو دیکھ لیں عقل بڑی ہے کہ بھینس، پہلے تو یہ بتائیں کہ عقل ہے کہاں کبھی دیکھی' سنی' چکھی' خواہ مخواہ کسی نے کہہ دیا کہ عقل نام کی کوئی چیز ہے اور دنیا اس کے پیچھے لگ گئی۔ کسی نے کہا کتا تمہارا کان لے گیا کان کی خبر نہیں لی اور کتے کے پیچھے دوڑ پڑے۔ جو چیز دیکھی نہ سنی آج اس کی بڑائی بیان کر رہے ہیں۔ بھینس اتنی بڑی جسیم اور کیم پھر بھی زمانے بھر کی ستم ظریفی دیکھئے کہ پھر کہیں گے نہیں جناب عقل بڑی ہے بھینس نہیں۔

چلئے اب نام کو لیجئے عقل ۔ ع ۔ ق ۔ ل ۔ اور بس نام ختم ہو گیا۔ جبکہ بھینس کے نام کے حروف گن کر دیکھ لیں ڈھٹائی کی کوئی انتہا ہوتی ہے۔ اب بھی اگر اس کی بڑائی کا کوئی اعتراف نہیں کرتا تو آپ کو ایک کہانی سنائے دیتا ہوں۔

کہتے ہیں کسی گاؤں میں ایک کسان کی لاٹری نکلی آپ جیسی عقل والا آدمی اس کے پاس گیا اور کہنے لگا بھلے مانس ان پیسوں کی ایک کار خرید لو۔ خود بھی سیر کرو۔ بیوی بچوں کو بھی سیر کراؤ۔ اس نے کہا۔ نہیں جناب کار نہیں خریدوں گا۔ میں تو بھینس خریدوں گا۔ عقل

والے نے کہا۔ جب تم شہر جانے کے لئے بھینس پر سواری کرو گے تو دنیا تجھے بے وقوف اور پاگل نہیں کہے گی۔ اس نے کہا اور جب میں کار کے نیچے دودھ دوہنے بیٹھوں گا تو لوگ مجھے عقل مند کہیں گے۔ تم اپنی عقل اور کار کو رکھو اپنے پاس۔ مجھے تو بھینس کی ضرورت ہے۔ وہی خریدوں گا۔ دودھ، دہی، مکھن ہر چیز استعمال کروں گا اور بوقت ضرورت سواری بھی کر لوں گا۔ عقل والا اپنا سامنہ لے کر رہ گیا جیسے آج تم بھی اپنا سامنہ لے کر رہ جاؤ گے۔

عقل بڑی کہ بھینس

(مثبت خیالات)

اور تو کچھ کہہ نہیں سکتا کہ کیا تھا کون تھا
بات سچی کہنے والا سب کو دیوانہ لگا

جناب صدر! اورارباب عقل وشعور!

آج ایک عجیب بحث چھڑ گئی ہے کہ عقل بڑی ہوتی ہے کہ بھینس۔ آج ہم صاحبان عقل وہوش کے لئے یہ بہت بڑا چیلنج ہے۔ اگر آج ہم عقل کی بڑائی ثابت نہ کر سکے تو بڑی کم عقلی ہو گی حقیقت تو یہ ہے کہ بڑائی صرف عقل کے حصہ میں آتی ہے اور یہ حقیقت صدیوں سے مسلم بھی ہے۔ بچے بوڑھے جوان سب اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں اگر ان میں سے کوئی بھی بھینس کی بڑائی کی بات کرے گا تو ہر صاحب عقل بول اٹھے گا یہ کیا بکواس ہے کیا ہرزہ سرائی ہے۔

حضرات باوقار!

اس جدت پسندی پر ایک بات یاد آ گئی۔ سنا ہے کسی گاؤں میں چار اندھے رہتے تھے۔ ایک دن گاؤں میں ایک ہاتھی والا آ گیا۔ یار لوگوں نے حافظ حضرات سے کہا۔ ساری دنیا ہاتھی دیکھنے جا رہی ہے۔ آپ اللہ تعالیٰ کی شان جا کر دیکھ آئیں۔ وہ بھی چل دیئے جب دیکھ کر واپس آئے تو کسی نے پوچھا حافظ صاحبان آپ نے ہاتھی دیکھا ہے بتائیں کیسا ہوتا ہے۔ کہنے لگے بھائی یہ بھی کوئی پوچھنے والی بات ہے کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے۔ ہاتھی چھاج کی طرح ہوتا ہے۔ دوسرے نے کہا نہیں جناب وہ تو دیوار کی طرح ہوتا ہے۔ تیسرے حافظ صاحب فرمانے لگے، تم بھی عجیب احمق آدمی ہو ہاتھی تو ستون کی طرح ہوتا ہے۔ چوتھے حافظ صاحب نے بھی بس ایسی ہی ہانک دی پوچھنے والے نے سوچا عجیب بات ہے۔ دنیا

صدیوں سے ہاتھی دیکھتی آئی ہے اور ایسا ہی دیکھا جیسا کہ ہے لیکن حافظ حضرات نے ہاتھی دیکھنے میں ایک جدت پیدا کی ہے اس دیکھنے میں جدت پسندی کا رنگ نظر آتا ہے۔ گویا جدت پسندی کے لئے صرف اندھا ہونا کافی ہے۔ جس طرح آج میرے فریق مخالف جدت پسندی کے جذبہ کے تحت عقل کی نسبت بھینس کو بڑا کہہ کر ایک بالکل جدت اختیار کریں گے اور بھینس کی بڑائی ثابت کرنے کے لئے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیں گے اس ایوان کے حافظوں کو سمجھاؤ کہ اندھو! بھینس بڑی نہیں ہوتی عقل ہی بڑی ہوتی ہے۔

اے ارباب محفل!

ایک حقیقت یہ بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ اگر ایک شخص کے پاس عقل موجود ہو اور وہ اس عقل سے کام لے تو پھر تو عقل ہی بڑی ہے اور اگر عقل سے کام نہ لیا جائے تو پھر بھینس ہی بڑی ہے۔ آیئے ہم سب مل جل کر ان کو سمجھائیں کہ دوستو! عقل کے ناخن لو اور ہوش سے کام لو عقل کی بڑائی کا اعتراف کر لو دوستو! عقل واقعی بڑی چیز ہوتی ہے۔ ذرا عقل استعمال کر کے تو دیکھو۔

اے مسند نشین صدارت!

عقل ہی نے بڑی بڑی چیزوں پر قابو پایا۔ ہر درندے کی درندگی سے انسانیت کو بچانے کی خاطر اس کے جبڑے کو توڑا یا لگام دی۔ وسعتوں کو سمیٹا گہرائیوں کو کھنگالا اور اونچائیوں کو زیر کیا۔ یہ اس عقل کی بڑائی کا اعتراف ہے کہ انسانیت حیوانیت سے نکل کر انسانی عظمت کے تاج کی قدر شناس ہوئی اور کائنات کی ہر چیز کو مسخر کر لیا۔ چاند پر کمندیں ڈالیں۔ زمین کی پنہائیوں سے خزانے اگلوائے اور اپنی جھولیاں بھر لیں۔

سمندروں کو چیرا۔ لیکن کتنے بدنصیب ہیں کچھ لوگ جو آج بھی جذبہ حیوانیت سے مجبور ہو کر عقل سے صرف نظر کر کے پھر اس مجسمہ حیوانیت بھینس کی بڑائی منوانے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔

جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے جنوں کو کہ دیا خرد ، خرد کو جنوں

حضرات محترم!

عقل کی بڑائی کے لئے کائنات کا ذرہ ذرہ ثبوت فراہم کر رہا ہے۔ نباتات ننھی کونپلیں انسانیت کے ہاتھوں کو اور کوہساروں کی بلند چوٹیاں انسان کے قدموں کو چوم کر عقل کی بڑائی کا اعتراف کرتی ہیں کہ واقعی اگر انسان عقل سے کام نہ لیتا تو آج تک غاروں کی ذلت آمیز زندگی کی دلدل میں پھنسا ہوتا اور کبھی کسی بڑائی کا سہرا اس کے سر زیب نہ دیتا۔ لیکن ان عقل کے دشمنوں کو کون سمجھائے کہ اے حیوانیت زدہ انسانو! حیوانیت سے باہر آؤ۔ یہ دنیا بڑی وسیع ہے۔ اس وسیع و عریض کائنات ارضی و سماوی کے اسرار و رموز اور فیوض و برکات سے لطف حاصل کرو اور یہ صرف اس وقت ممکن ہے جب تم عقل کی عظمت اور بڑائی کا اعتراف کرو۔

حضرات گرامی!

کتنی عجیب سی بات ہے کہ بھینس عقل سے بڑی ہوتی ہے اگر بڑی ہوتی تو عقل و شعور کے مالک انسان کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالے یوں گلی کوچوں میں ماری ماری نہ پھرتی ایک کھونٹے سے بندھی چارے کی محتاج بیچاری عقل سے بڑی ہے۔ خوب بھائی خوب اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔

صدر محترم!

اب آخر میں ان عقل کے اندھوں اور عقل کے دشمنوں اور اس ایوان کے حافظوں کے حق میں دعا خیر ہی کر سکتا ہوں۔

اے خدا جو بھی مجھے پند شکیبائی دے
اس کی آنکھوں کو میرے زخم کی گہرائی دے
تیرے لوگوں سے گلہ ہے میرے آئینوں کو
ان کو پتھر نہیں دیتا ہے تو بینائی دے

استاد کا احترام

اے میرے عظیم ساتھیو! اور مستقبل کے روشن ستارو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

اس دنیا میں قدرت نے ماں اور باپ کو ایک عظیم نعمت کے طور پر پیدا کیا ہے۔ اگر ماں کی ممتا اور باپ کی شفقت نہ ہوتی تو کوئی بچہ سن بلوغ اور سن شعور کو باحسن وخوبی نہ پہنچ سکتا۔ دنیا کے ہر بچے پر والدین کا احسان ہے کہ وہ کمال محبت کے ساتھ بچے کو پروان چڑھاتے ہیں۔ لیکن دنیا میں ایک اور شخصیت بھی ہے۔ جس کا احسان ماں باپ سے بھی بڑھ کر ہے اور وہ ہستی عظیم استاد کی ہے۔ ماں باپ ہمارے جسم کی پرورش کرتے ہیں۔ جبکہ روح کی پرورش ہمارے استاد کرتے ہیں۔ ہمیں علم و دانش عطا کرتے ہیں۔ اچھے برے میں تمیز کرنے کی صلاحیتیں بخشتے ہیں۔

حضرات باوقار!

ہمارے آقا ومولا حضرت محمد مصطفی ﷺ فداہ امی وابی الفاً الفاً نے ارشاد فرمایا:

انما بعثت معلماً

یعنی میں تو ایک معلم بنا کر بھیجا گیا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی جہاں مومنوں کو مخاطب کرتے ہوئے احسان جتایا ہے کہ میں نے ایک رسول بھیجا وہاں آپ کی یہ صفت بھی بیان کی گئی ہے کہ وہ تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔

میرے دوستو!

صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین ارشاد فرماتے ہیں جب ہمیں نبی کریم ﷺ تعلیم دیتے تھے۔ تو ہم آپ کے سامنے اس طرح خاموش بیٹھے ہوتے تھے۔ جیسے ہمارے سروں پر پرندے بیٹھے ہوں گویا ہم ان کی بات کو انتہائی غور سے سنتے۔ گویا ہمیں یہ سبق ہے

کہ جب ہمارے استاد ہمیں تعلیم دیتے ہیں تو ان کے ارشادات غور سے سنیں۔ انہیں سمجھنے کی کوشش کریں اور یاد کرنے کا عزم لے کر چھٹی ہونے پر رخصت ہوں۔ استاد صاحبان کا احترام کریں دل سے عزت کریں۔ ان کا حکم مانیں۔ جو شخص تعلیم سے محروم ہے۔ اس سے تعلیم کی قدر پوچھو سارا سارا دن گرمی و سردی میں محنت و مزدوری کرتا ہے۔ نہ گفتگو کا سلیقہ ہے نہ پہننے اور اوڑھنے کا۔ نہ آداب محفل جانتا ہے۔ اور نہ حسن معاشرت، یہ سب نعمتیں استاد کے صدقے میں ملتی ہیں۔ اس لئے ان نعمتوں کے شکریئے میں بھی اور ویسے اپنے مقدس پیشے کے اعتبار سے بھی استاد ایک عظیم ہستی ہے میرے دل کی دھڑکنیں عقیدت و احترام سے حضرات اساتذہ کو سلام کرتی ہیں۔

اے صدر محترم اور ارباب ذیشان!

فارسی کا مقولہ ہے" ہر کہ خدمت کرد او مخدوم شد" یعنی جو خدمت کرتا ہے اسی کی خدمت کی جاتی ہے۔ اگر قوم چاہتی ہے اور مستقبل کے روشن ستارے اپنی چمک و دمک میں مزید رعنائیاں دیکھنا چاہتے ہیں تو اس کا صرف ایک راستہ ہے کہ ان عقل و ہوش دینے والوں کی عزت و تکریم کا سہرا سجالیں۔ کل طلوع ہونے والا سورج اگر استاد کی تکریم کرنے والوں سے اجازت لے کر طلوع نہ ہو تو پھر کہنا۔

تم اپنے خیالوں کو مجھے سونپ کے دیکھو
ہر شخص امانت میں خیانت نہیں کرتا

استاد اور مدرسہ

اب کہاں بوئیں گے الفاظ و معانی کے درخت
سوچ کے جتنے جزیرے تھے وہ دلدل ہو گئے

اے مسند صدارت کی رونق اور ارباب محفل!

مہک اور عطر بیزیاں چمن کے راستے در آتی ہیں۔ فضاؤں اور ہواؤں میں تعطر وہ پھول پیدا کرتے ہیں۔ جو کلیوں اور غنچوں کا سفر طے کرتے ہوئے پھول بنتے ہیں۔ اور اپنی عنبر فشانی سے صحن چمن کو چمن پر بہار بناتے ہیں۔ لیکن یہ پھول خود تو بے جان ہیں۔ دراصل ان کے پس منظر میں وہ ہاتھ ہے۔ جس کی مسلسل کاوش و سعی سے کھیت میں بہار آئی ہے۔ کلیاں کھلیں، غنچے چٹکے، پھول مہکے اور مشام جاں معطر کرتے گئے اگر یہ ہاتھ نہ ہوتا تو شاید پھول تو کھلتے کلیاں بھی چٹکتیں لیکن صحن چمن پر بہار نہ بنتا۔ درخت پیدا ہوتے لیکن جھاڑیاں بنتے اور ثمر آور نہ ہوتے یہی وہ مقدس ہاتھ جو آج زیب موضوع ہے۔

بار الہٰ میری زباں پہ یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے میری زباں کے لئے

اے رونق محفل دانشوراں!

مدرسہ ایک ایسا صحن چمن ہے جس نے ابتدائے آفرینش سے اپنے وجود کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔ کائنات ارضی و سماوی میں روشنی اسی کی مرہون منت ہے۔ ذہنوں کے بند دریچے اس نے کھولے، کائنات کی ساری گتھیاں اسی نے سلجھائیں، ارض و سما کی محفل کی رونق، لعل و جواہر کی دریافت، سمندروں کی عمیق گہرائیوں میں موتیوں اور خزانوں کی تلاش، فضاؤں کی بسیط وسعتوں پر کنٹرول، سیاروں اور ستاروں پر کمندیں یہ سب اسی چشمۂ فیض کا فیض ہے۔ اس کا عدم وجود محرومیوں، ناکامیوں اور اندھیروں سے عبارت ہوتا۔ یہی وہ

مرکز ہے جس کے گرد ساری کائنات دائرہ ہے۔ یہی وہ پرکار ہے جس کی مقناطیست نے ہر چیز کو اپنے دائرہ میں سمیٹ لیا ہے۔ لیکن یہاں یہ حقیقت بھی باور کیے بغیر چارہ نہیں کہ مدرسہ بھی صحن چمن کی طرح کسی ہاتھ کا محتاج ہے۔ وہ ہاتھ ایک استاد کا، معلم کا اور ایک فنکار کا ہے۔ جس کی پیہم نوازشوں نے انسان کو انسانیت سکھائی۔ قعر مذلت سے نکالا اور اوج ثریا تک پہنچایا۔ یقین جانیئے وہ ہاتھ اسی استاد کے ہیں۔ بقول شاعر

مجھے اقبال اک سید کے گھر سے فیض پہنچا ہے
پلے جو ان کے ہاتھوں میں وہی کچھ بن کے نکلے ہیں
اس کی پیہم نوازشوں پہ جب بھی غور کیا
گماں ہوا جہنم بجھا دیا اس نے

حضرات با تمکین!

بدقسمتی سے ہم جس دور میں پرورش پارہے ہیں اس دور میں جہاں دیگر ہزارہا مسائل و مصائب اور آلام نے ہمیں خوش آمدید کہا ہے۔ وہاں سب سے زیادہ تکلیف دہ یہ امر بھی ہمارے پلے پڑا ہے۔ کہ چمن کے مالی باغ میں پھول نہیں کانٹے کاشت کر رہے ہیں۔ مدرسہ میں اہل مدرسہ نے علم کی روشنی دینے، خود آگاہی، خودشناسی کا سبق دینے۔ کرگس و شاہین کے درمیان امتیاز کرنے کی صلاحیتیں بخشنے کی بجائے ایسا علم دیا ہے جس سے خود آشنائی و خودنمائی، احساس برتری، تجاہل عارفانہ، خلق و مروت سے عاری ہونے کے ایسے اندھیرے دیئے ہیں کہ انسانیت بھٹک کر رہ گئی ہے۔ اس اندھیرے میں جسے اپنی خبر نہیں اسے اپنے رب ذوالجلال کی کیا خبر ہوگی اور خالق کائنات تک پہنچانے کا علم کہاں سے دے سکے گا کبھی سویا ہوا بھی جگا سکتا ہے۔ کبھی ڈوبنے والا بھی کسی کا سہارا بن سکتا ہے۔ اندھا تو خود اندھا ہے۔ وہ بینائی کی دولت کہاں سے تقسیم کرے گا۔

گلا تو گھونٹ دیا اہل مدرسہ نے تیرا
کہاں سے آئے صدا لاالہ الا اللہ

صدر والا شان!

وہ کیا سہانا دور ہوگا جب آپ کے اور ہمارے بزرگ بڑ کے درخت کے نیچے ٹاٹ پر بیٹھ کر پڑھتے تھے اور اہل مدرسہ کی خوئے دلنوازی کے ساتھ ساتھ خوف خدا اور یاد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جذبات موجزن تھے وہ بچوں میں اپنی دولت علم وفن اور جذبہ خداشناسی ودیعت کرتے تھے۔ جن کے پاکیزہ اثرات آج بھی پائے جاتے ہیں۔ آج ہمیں فریاد کرنے کا حق دیجئے۔ ہمیں پھر اسی مقام پہ لے جایئے۔ جہاں بلند و بالا عمارات نہ تھیں۔ اتنے نظم و ضبط کے دکھاوے نہ تھے۔ فیسوں کا دباؤ نہ تھا کتابوں اور بستوں کے اتنے بوجھ نہ تھے۔ لیکن علم ایسا دیا جاتا تھا۔ کہ بچہ حصول علم کے بعد خود شناس بھی ہوتا اور خداشناس بھی ہوتا تھا۔

جس قدر تسخیر خورشید و قمر ہوتی گئی
زندگی تاریک سے تاریک تر ہوتی گئی

حضرات محترم!

اب آخر میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ آج ہم جس ڈگر پر چل نکلے ہیں۔ جس انداز سے ہمارے مدارس نسل نو کی تخلیق کر رہے اور اہل مدرسہ جس طرح حرص و آز کی دلدل میں گرتے جارہے ہیں۔ ذرا سوچیئے اس انداز سے مستقبل میں طلوع ہونے والا سورج کیسا طلوع ہوگا۔

دیکھنا یہ حبس کا عالم رہا تو ایک دن
اک بگولا آئیگا سب کچھ اڑا لے جائے گا
مدعی رہ جائیں گے فریاد کرتے قتل پر
اور قاتل مسکراتا خوں بہا لے جائے گا

رئیس مدرسہ کی طرف سے الوداع

معزز رفقاء کرام اور مستقبل کے روشن ستارو!

السلام علیکم!

آج کی تقریب سعید ان طلبہ کو الوداع کہنے کے لئے انعقاد پذیر ہوئی ہے۔ جو اس ادارہ میں جماعت دہم تک علم و فن کی دولت سے مالا مال ہو چکے ہیں۔ ایک ساتھ رہتے انس و مروت پیدا ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ اور خاص طور پر جب کہ یہ ساتھ ایک شفیق باپ اور فرمانبردار بیٹے کا ہو تو اس کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔ تاہم اس میں قانون فطرت کے مطابق ایک حسین پہلو بھی موجود ہے۔ کہ ان طلبہ کی ایک کھیپ تیار ہو کر زندگی کے وسیع میدان میں سرگرم عمل ہونے کے لئے آگے بڑھ رہی ہے۔ اس کھیپ سے امید کی جاتی ہے۔ کہ اس دو میں ایک نئے اور اچھے باب کا اضافہ کریں گے۔

عزیزان محترم!

جس طرح ایک عمارت کی تعمیر اچانک نہیں ہو جاتی۔ بلکہ یہ تعمیر ایک ایک اینٹ اور ایک ایک مرحلہ سے عبارت ہوتی ہے۔ اس طرح بچوں کی یہ تعلیمی عمارت بھی اچانک تعمیر نہیں ہوتی۔ خون دل صرف کیا جاتا ہے۔ تو بہار آتی ہے۔ میں اور میرے جملہ رفیقان سفر اس تعلیم کی عمارت میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ یہ تعمیر جامد و ساکت نہیں بلکہ چار دانگ عالم میں پھیل جانے والی ہے۔ اگر اس تعمیر یعنی ہمارے تربیت یافتہ طلبہ نے اس عالم میں ایک روشن اور خوبصورت باب کا اضافہ کیا۔ تو یقیناً ہم اپنے فن میں ماہر بھی ہیں اور اپنے فن سے مخلص بھی۔ اگر خدانخواستہ ایسا نہ ہوا تو یقین جانئے نہ تو ہم اپنے فن میں ماہر ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں اور نہ ہی اپنے آپ سے، اپنی قوم سے اپنے ملک سے اور دین و وطن سے مخلص ہونے کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ اس صورت میں ہم اپنے خدائے بزرگ و برتر اور معلم کائنات

ﷺ جن کے مقدس پیشے کو اختیار کیا ہے یقیناً ایک روز ہم سے ضرور باز پرس کریں گے۔

اے پیارے بچو!

اب آخر میں آپ سے مخاطب ہوں۔ کہ صابن اور سرف جتنا بھی اعلیٰ ہو۔ وہ کالے کمبل کو سفید نہیں کر سکتا۔ البتہ سفید کپڑے کے میل کچیل کو صاف کر دیتا ہے۔ ہم نے آپ کے روح دجسم سے جہالت کے کالے میل کو صاف کرنے کی حتیٰ المقدور کوشش کی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو مزید علم وفن کے اجالے عطا فرمائے۔ میں اپنی طرف سے یقین دلاتا ہوں۔ کہ تمہیں زندگی کے کسی میدان میں ہماری ضرورت پڑے تو ہماری تمام تر صلاحیتیں تمہارے لئے ہوں گی۔ ان شاء اللہ خدا ہم سب کا حامی وناصر ہو۔

دشمن بھی جو آئے تو میرے سائے میں بیٹھے
میں ایک گھنا پیڑ سر راہ گزر ہوں

تعلیم کے لئے ڈنڈا اور پٹائی بہت ضروری ہے؟

آدمیت اور شے ہے علم ہے کچھ اور چیز
کتنا طوطے کو پڑھایا پھر بھی حیواں ہی رہا

اے مسند نشین صدارت اور ارباب فکر وشعور!

حالات نے کیسی کروٹ کھائی اور ڈھیٹ پنے کی حد ہوگئی۔ اب ہر برائی کو علی الاعلان کرنے کی وباء کی طرح تعلیم جیسے نرم و نازک سلسلے کو بھی پٹائی سے مشروط کیا جانے لگا ہے۔ اندھے کو اندھیرے میں بہت دور کی سوجھی۔ لیجئے! جناب ہم بھی آپ کی خاطر وقتی طور پر آپ کے ہمنوا بن جاتے ہیں کہ تعلیم کے لئے پٹائی بہت ضروری ہے لیکن کن کے لئے! ان لاتوں کے بھوتوں کے لئے جو نرم و نازک، شیریں اور پیار و محبت کی بات نہیں سمجھتے۔ پہلے زمانے میں ہم کسی ڈھیٹ اور بے شرم بچے کو جب سمجھاتے سمجھاتے تنگ آ جاتے تھے۔ جب کھیل کود کے علاوہ سمعی و بصری معاونات کے تمام جدید طریقے آزمانے کے باوجود مایوس ہو جاتے۔ جب لالچ اور پیار جیسے تمام طریقے ناکام ہو جاتے۔ تو آخر تھک ہار کر کہتے جی ہاں جو مرضی کرلو۔ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانتے۔ لیکن اب ہمیں ایسے ڈھیٹ لوگوں سے واسطہ پڑا ہے جو اس بھرے ایوان میں زور دے کر اسی نظام کو پوری قوم پر نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ تمام لوگوں کو اسی ڈنڈے کے زور سے ہانکنا چاہتے ہیں۔ لیکن جناب! ہم بصد عجز و نیاز عرض کرتے ہیں کہ ہمیں اپنے آپ پر قیاس نہ کیجئے۔ ہم ایسے نہیں ہیں۔ ہم استاد صاحب کے اشارہ ابرو کی لطافت کو سمجھتے ہیں اور اسے تسلیم کرنے کی خو رکھتے ہیں۔

حضرات محترم!

ایک صاحب اپنا چشمہ گھر بھول آئے۔ دفتر جا رہے تھے راستے میں ایک جگہ کوئی اشتہار لگا ہوا دیکھا، جب اسے پڑھنے لگے تو احساس ہوا چشمہ یعنی عینک تو گھر بھول آیا

ہوں۔ انہوں نے پاس کھڑے ایک صاحب سے پوچھا، جناب! دیکھیں ذرا اس اشتہار پہ کیا لکھا ہے۔ تو وہ کہنے لگے جناب! میں بھی آپ کی طرح ان پڑھ ہوں۔

واہ سبحان اللہ! ان، ان پڑھ صاحب کی طرح یہ پٹائی صاحب بھی چاہتے ہیں کہ اب ساری دنیا کو پٹائی سے پڑھائی کرائی جائے۔ جناب شکریہ نوازش اور مہربانی! ہمیں معاف کیجئے۔ بڑی عافیت سے بسر ہو رہی ہے یہ نعمت اگر آپ کے حصہ میں آ گئی ہے تو قبول کر لیجئے اپنی خوب مرمت کروایئے اور ضرور کروایئے۔ اگر ارشاد ہو تو آپ کے مرغا بننے کے اور پٹائی کے مناظر دیکھنے کے لئے ہم بھی حاضر ہو جایا کریں۔ ان شاء اللہ۔

صدر ذیشان!

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی فکری و نظری تعلیمات کے اظہار کے لئے اشعار کا سہارا لیا ہے اور اشعار ہی کو ذریعہ اظہار بنایا ہے۔ جبکہ اشعار ادب کی ایک ایسی صنف نازک ہے جو صرف نرم و نازک اور لطیف اذھان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ غبی اور کند ذہن اس کی لطافت کو سمجھ ہی نہیں سکتے۔ اس لئے انہوں نے ہری چند کی اس فکر کو اپنی کتاب کا سر نامہ قرار دیا ہے۔

پھول کی پتی سے کٹ سکتا ہے ہیرے کا جگر
مرد ناداں پہ کلام نرم و نازک بے اثر

یعنی نرم و نازک گفتگو ایک مرد ناداں اور احمق پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ صاف ظاہر ہے کہ تعلیم و تعلم کا سلسلہ بھی اسی طرح ان جیسے مردان ناداں اور احمقوں پر کوئی اثر نہیں کر سکتا۔

عزیزان محترم!

ہم پنجابی زبان میں ایک محاورہ سنا کرتے تھے کہ جناب! آ سمانوں اتریاں چار کتاباں پنجواں اتریا ڈنڈا۔ یہ چار اور ایک کی ریشو اس بات کی علامت ہے کہ بدقسمت لوگوں کا وجود ہر دور میں چار اور ایک کی حیثیت سے رہا ہے۔ ہم ارباب فکر کے ذہن پر دستک دیتے ہوئے عرض کرتے ہیں۔ کہ وطن کی فکر کر ناداں مصیبت آنے والی ہے۔ یہ لوگ چار ایک کی

ریشو پر ایک جارکو مسلط کرنا چاہتے ہیں۔ یہ لوگ مارشل لاء لگانا چاہتے ہیں۔ مارشل لاء کی آمریت مسلط کرنا چاہتے ہیں۔اس لئے ہوش کے ناخن لیجئے۔

دل کی آزادی، شہنشاہی ،شکم ، سامان موت
فیصلہ تیرا تیرے ہاتھوں میں ہے دل یا شکم

حضرات محترم!

کسی دانشور نے بڑی ہی پیاری بات کہی تھی کہ ڈنڈے سے آپ سروں پرحکومت تو کر سکتے ہیں ، دلوں پرنہیں کر سکتے۔ اب جن کے پاس دل ہی نہ ہوں اور اگر ہوں بھی تو پتھر کے، وہ نرم و نازک اور گداز دلوں کے جذبات و کیفیات کو پڑھنا کیا جانیں۔ وہ تو جیسے راستے بنانے ،سڑکیں بنانے اور مکانات تعمیر کرنے کے لئے پتھر کو کوٹا جاتا ہےاور کوٹے بغیر گزارہ نہیں اسی طرح وہ پتھر جیسے بے حس و بے جان لوگوں کے سروں پر حکومت کرنے والے کہتے ہیں کہ اگر پڑھائی جیسا لطیف و نازک کام کرنا بھی پڑے تو وہ بھی پٹائی سے کرو۔ شاید ایسے ہی پٹائی اور مار کٹائی کے زور سے پڑھنے والوں کی محفل میں بیٹھنے والوں نے یہ نتیجہ نکالا ہو کہ

پڑھے لکھوں کی محفل میں ہوا یہ تجربہ ہم کو
کہ اہل دستخط سے تو انگوٹھا چھاپ اچھے ہیں

صدر محترم اور حاضرین محفل!

اب آخر میں قائد ایوان اور ان کے تمام حواریوں کو ہوش کے ناخن لینے کی پھر درخواست کرتا ہوں کہ لوگو! پیار و محبت کی زبان تو جانور بھی سمجھ جاتے ہیں ،تم کیوں نہیں سمجھتے۔ پھولوں کی نازک پتیاں دلوں کو گداز بخشتی ہیں۔تمہارے دل ڈنڈے کی بات کیوں کرتے ہیں۔

دوستو!

جنت کی بات کرو جہنم کی بات نہ کرو۔ یارو! ایک شفیق و مہربان استاد تلاش کرو۔ جلاد تلاش نہ کرو۔ جلاد جیلوں میں، تھانوں میں بہت ہیں۔ مستقبل کے معمارو! انداز جمہوریت لاؤ کہ وہ زندگی ہے، مارشل لاء کی بات نہ کرو کہ وہ موت ہے۔ آؤ آؤ۔ محمد عربی ﷺ کی بات کرو۔ ہلاکوؤں اور چنگیزوں کی بات نہ کرو۔ آؤ آؤ۔ اخلاق مصطفوی ﷺ کی بات کرو۔ ایٹم بم کی بات نہ کرو۔ تمہیں یقین آ جائے گا اور ضرور آئے گا۔

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

معاشرے میں پھیلتی ہوئی برائیوں کا سبب ہمارا پریس ہے

صدر ذی وقار اور ارباب محفل!

ہم کچھ ایسے سہل پسند اور ڈھیٹ واقع ہوئے ہیں کہ اپنی کسی غلطی وکوتاہی کا الزام اپنے سر لینے کو تیار نہیں ہوتے اس کے باوصف ایوان اقتدار سے اٹھنے والی صدا کو نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا میرے خیال میں ایک تعلیم یافتہ ماحول میں جدید نظریات کی ترویج نت نئی اور انوکھی ایجادات سے تعارف، ملکی وغیر ملکی حالات وواقعات بلکہ نظریات سے آگاہی اور تعلیم وتعلم میں ذرائع ابلاغ اہم ترین جزو ہیں۔ قلم ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ جب تک پریس قوم وملت کی روح کو صحیح اور پاکیزہ غذا فراہم کرتا رہے گا معاشرہ کبھی راہ راست سے بھٹک نہیں سکتا۔

جناب صدر!

کیا یہ ایک حقیقت نہیں کہ تحریک پاکستان میں دو قومی نظریہ یعنی نظریہ پاکستان کی بھر پور حمایت میں مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی جوہر، مولانا ظفر علی خان بہادر یار جنگ، محمد طفیل آف نقوش وغیرہ نے تہلکہ مچا دینے والے مضامین اور اخبارات نے تن خوابیدہ میں تازہ جان ڈال دی۔ وہ کونسا بجلی کا کڑکا تھا کہ جب اپنی گرج چمک کے ساتھ منصہ شہود پہ آتا تو انگریز کے مضبوط قدموں میں لرزش پیدا ہو جاتی۔ آج وہی پریس ہے جس نے ہماری منزل دھندلی کر دی ہے۔ آج کا پریس خصوصا پاکستان کا پریس انتہائی قابل مذمت ہی نہیں باعث نفرت ہوتا جا رہا ہے۔ عریاں تصاویر، فحش مضامین، غلط نظریات کے حامل اخبارات، ریڈیو، ٹیلی ویژن کے مخرب اخلاق گانے، مکروہ ڈائیلاگ اور ان کی تشہیر کی ذمہ داری پریس کے سوا اور کس پر ہے۔

عزیزان وطن!

اگر آپ مجھے جذباتی نہ کہیں تو مجھے ریڈرز ڈائجسٹ کی ادارتی انتظامیہ کو خراج تحسین پیش کرنے کی اجازت دیں۔ سنا ہے اس کی ادارتی پالیسی سگریٹ نوشی کے قطعاً خلاف ہے۔ اس لئے اس کے صفحات سگریٹ کے ناپاک پراپیگنڈہ سے مکمل پاک ہوتے ہیں۔

وفاداری بشرط استواری اصل ایماں ہے
مرے بت خانہ میں تو کعبے میں گاڑدو برہمن کو

لیکن کیا ہمارے ہاں سگریٹ کے ہر پیکٹ پر ڈینجرس کے الفاظ لکھے نہیں ہوتے۔ کیا ہمارے ہاں تمباکو نوشی کو امر شنیع قرار نہیں دیا گیا۔ اگر جواب اثبات میں ہے۔ تو پھر آج شام ہی اپنے ٹیلی ویژن سیٹ پر بیٹھ کر شروع سے لے کر آخر تک سگریٹوں کے اشتہارات گن لیجئے اور دیکھئے پریس اس کی طرف راغب کرنے کے لئے کتنے دلکش انداز اختیار کرتا ہے۔

اہل ستم کے ستم نہ پوچھو
کرم بھی ان کے یاد رہیں گے

کیا آج ہر بچے بوڑھے اور جوان کو اس خطرناک بیماری سے دو چار کرنے کا ذمہ دار ہمارا پریس نہیں ہے۔

شکوے تو ہزاروں ہیں مجھے آپ سے لیکن
ڈرتا ہوں خفا مجھ سے نہ ہو جائیں کہیں آپ

صدر ذی شان اور ارباب دانشوراں!

ہمارا دین، ہمارا مذہب، ہمارا کلچر اور مشرقی تمدن، عورتوں کی عریانی و برہنگی کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن ہمارا پریس مستورات کو مکشوفات کے معنی دینے پر ادھار کھائے بیٹھا ہے۔ کوئی ایڈیٹر کوئی رائٹر، کوئی ٹیلی ویژن کا نمائندہ اسٹیج پر بلا لیں۔ اسے کہئے کہ جناب والا۔ بتائیے معاشرے میں پھیلتی ہوئی برائیوں کا سبب کیا ہے۔ ان میں اکثریت فلمی دنیا کو بدنام کرے گی۔ پھر ان کے اسٹیج سے اترتے ہی ان کے اخبارات، ان کے اشتہارات، رسائل

اور جریدے ان کے آگے رکھ دیں۔ اخبارات و رسائل کے نصف سے زائد صفحات پر فلموں کے اشتہارات ان کی صداقت اور حسن بیانی کا منہ چڑا رہے ہوں گے۔

اب کہاں بوئیں گے الفاظ و معانی کے درخت
سوچ کے جتنے جزیرے تھے وہ دلدل ہو گئے

معاشرے میں پھیلتی ہوئی برائیوں کا سبب ہمارا پریس نہیں ہے

اے مسند نشین صدارت اور ارباب دانشوراں!

ابھی تھوڑی دیر پہلے میرے پیشرو دبی زبان میں اعتراف گناہ کرتے ہوئے بھی پریس کو موردالزام ٹھہرا گئے۔ یہ لوگ کتنے عجیب ہیں۔ بلکہ عجوبہ روزگار ہیں کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ کہ گناہگار ہونا اتنا برا نہیں جتنا گناہ کر کے اپنی گندگی دوسروں کے سر تھوپ دینا ہے۔

صدر ذیشان!

پہلے یہ رواج تھا۔ اور ہر شخص کی زبان پر ہوتا کہ اجی کیا کریں معاشرہ بگڑ گیا ہے۔ دودھ میں پانی ملانے والا، مرچوں میں اینٹیں پیس پیس کر ملانے والا غرض ہر شخص معاشرے پر تنقید کرتا ہے اور اب یہ فیشن چل نکلا ہے کہ معاشرے کی کسی خاص صنف کے پیچھے پڑ جاؤ اگر مجرم نہ بھی ہو تو بھی اسے بنا کر ہی چھوڑا جائے۔

حضرات محترم!

آیئے ذرا عنوان کے الفاظ کا تجزیہ کریں لفظ معاشرہ کی میم سے مراد غالباً ماں تھی۔ جس نے کبھی محبت کی لوریاں سنا سنا کر الطاف حسین حالی، جوہر، حسرت موہانی، قائداعظم، علامہ اقبال جیسے عظیم سپوت پیدا کیے لیکن آج قوم اور معاشرہ اس کی محبت سے محروم ہوتا جا رہا ہے۔ اور یہ اصول مسلمہ ہے کہ محبت سے محرومی جرائم کا پیشہ خیمہ ہوتی ہے۔

معاشرے کے لفظ کا دوسرا حرف ''ع'' سے مراد غالباً علم تھا جس کی بناء پر حضرت انسان مسجود ملائک ہوئے لیکن آج کا طالب علم، علم کے حصول کے بعد علامہ نہیں بنتا بلکہ سراسر الاہمہ بنتا ہے اور کیا یہ حقیقت نہیں کہ جہالت برائیوں کی جڑ ہے۔

اے ارباب عقل ودانش!

معاشرے کی ''شین'' غالباً شرفا کی تھی لیکن جب شرافت کا معیار وہ دروازے قرار دیئے جائیں۔ جن کے سامنے سے عزت وعصمت بھی اپنا دامن بچا کر نکلے۔ ایسے میں بھی آپ پریس کو ہی موردالزام ٹھہرائیں تو کتنی حیرت کی بات ہے۔

گاہے گاہے اسے پڑھا کیجئے
دل سے بہتر کوئی کتاب نہیں
وہ کرم انگلیوں پہ گنتے ہیں
ظلم کا جن کے کوئی حساب نہیں

الغرض معاشرے کے ہر حرف کی چیخ وپکار قوم کے مجموعی ضمیر کو جھنجوڑ جھنجوڑ کر کہہ رہی ہے کہ اے پریس کو برائیوں کا سبب قرار دینے والو! مجھے تو تمہارے دامن پر بھی خون کے دھبے نظر آ رہے ہیں۔

کس نے کس کا خون کیا ہے کس کس کو تم ڈھونڈو گے
دنیا والے رکھ لیتے ہیں ہاتھوں کو دستانوں میں

تمہیں دوسروں کی آنکھ کے تنکوں کے ساتھ ساتھ اپنی آنکھ کا شہتیر نظر کیوں نہیں آتا، خدارا پہلے اپنی بغل میں چھپائے ہوئے خنجر کے ٹکڑے تو کرلو مجھے اس سے خوف آتا ہے کہ یہ خنجر خود تمہارے پیٹ کو چاک نہ کر ڈالے۔ ہر بات میں جھوٹ مکروفریب، رشوت ستانی، حل وحرمت کی تمیز کیئے بغیر حصول زر کا بھوت ہر ذہن پر سوار ہے خود بینی وخودنمائی کا چسکا۔ اور عزت وشرافت کے معانی اپنی مرضی کے مطابق بدلنے پر قدرت اور بہت سے وہ تیر میرے پریس کے کچوکوں سے زیادہ تکلیف دہ ہیں۔

اتنی سی گزارش ہے میری اہل نظر سے
انساں کو خریدا نہ کرو لعل وگہر سے

عورتوں کو اعلیٰ تعلیم دلانا محض دولت اور وقت کا ضیاع ہے؟

آئیں گی جب کالجوں سے پاس ہو کر بیبیاں
حکمراں مردوں پہ ہوں گی مثل افسر بیبیاں
حکم قرآں ہے کہ منہ تک بھی رہے زیر نقاب
اور یہاں پھرتی ہیں کھولے سر بھی اکثر بیبیاں

تعلیم ہر مرد و عورت کے لئے بقدر ضرورت واقعتاً لازمی ہے تاجر تاجرانہ تعلیم حاصل کرے اس کے لئے تدریس کا علم بے مقصد ہے۔ ڈاکٹر طبی علوم کے گہر ہائے تابدار جمع کرے اور اپنی جھولیاں بھرلے لیکن اس کے لئے سڑکیں بنانے اور اس میں استعمال ہونے والے میٹریل کا علم حاصل کرنا بے معنی ہے۔ مسند انصاف کو زینت بخشنے والے حضرات اگر کتابت کے فن کی تمام باریکیوں کے حصول میں لگ جائیں۔ تو عدالتوں میں انصاف کے طالب ٹھوکریں کھاتے پھریں گے بالکل اسی طرح مرد اپنی فیلڈ کے علوم حاصل کرے اور عورت اپنے گھر اور اس کی چار دیواری کے علوم تک محدود رہے اسے اس بات کا یقیناً علم ہونا چاہئے کہ گھر جو اس کی جنت ہے۔ اسے سنوارنے کے لئے کیا کیا جا سکتا ہے۔ اس گھر میں اس کی زیر شفقت پلنے والے مستقبل کے روشن ستاروں کو کس طرح مزید چمکایا دمکایا جا سکتا ہے۔ لیکن آج کی مستورات مستورات نہیں۔ اعلیٰ اور بے مقصد تعلیم کے صدقے مکشوفات بنتی جا رہی ہیں۔ ماں کی ممتا کے جذبات سے ناآشنا۔ امور خانہ داری سے نابلد۔ نت نئے فیشنوں کی اتنی دلدادہ کہ مجھے کہنا پڑتا ہے۔

خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں — خدا کے فضل سے بیوی میاں دونوں مہذب ہیں

صدر ذی احتشام!

جس طرح ایک جج کے مسند انصاف کو چھوڑ کر کتابت سیکھنے کے لئے مصروف ہو جانے

پر انصاف کے طالب ٹھوکریں کھاتے پھریں گے۔ بالکل اسی طرح اس عظیم ماں کی مقدس گود سے محروم ہونے والے بچے گلیوں اور بازاروں میں ٹھوکریں کھاتے پھرتے ہیں۔ نہ گفتگو کا قرینہ اور نہ بات کرنے کا سلیقہ اور ماں، ماشاءاللہ تعلیم کے حصول کے لئے ستاروں سے بھی آگے کے جہاں کی تلاش میں ہے۔

پڑھائے گی یہ خاوند کو بڑی استاد نکلے گی
کہ بی اے کر کے لڑکی کا ارادہ اب ہے بی ٹی کا

حاضرین با تمکین!

تعلیم انسان کو انسانیت کے اعلیٰ مدارج سے آشنا کرتی ہے۔ شرافت، محبت، اخوت، حیا و شرم اور پیار کا سبق دیتی ہے۔ چاہئے تو یہ تھا کہ اگر عورت گھر سے اعلیٰ تعلیم کے حصول کیلئے نکل ہی آئی تھی۔ تو اسے دیکھ کر سر عقیدت جھک جاتا۔ خراج نیاز پیش کرنے کو جی چاہتا اور برملا کہنا پڑتا کہ

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توقیر گھٹتی ہے
میں مسجود ملائک ہوں مجھے انساں ہی رہنے دو

لیکن ہوا کیا کہ آج کی اس نام نہاد اعلیٰ تعلیم نے صنف نازک کو سراسر خطرہ بنا دیا ہے۔

سرخ تلوے سرخ ناخن سرخ لب ڈینجرس ہی ڈینجرس ہیں عضو سب

اے ارباب بزم!

آخر میں عرض کرتا جاؤں۔ میری قوم کی ماؤ اور بہنو! تمہیں تمہارا گھر تمہاری جنت پکار پکار کر کہہ رہی ہے کہ تو اخبارات کی زینت بننے کے لئے نہیں ہے۔ ریڈیو، ٹی وی اور فلموں کے سٹیجوں پر ناچنے اور تھرکنے میں تمہارا وقار نہیں ہے۔ سکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جا جا کر غیر محرموں سے فرینڈ شپ میں تمہارا تقدس نہیں ہے۔ آؤ گھر لوٹ آؤ تمہارا سکون تمہارا اطمینان تمہاری جنت تمہارا گھر ہے۔

اکو الف تینوں درکار اگوں بس کریں توں یار

میں کیا بنوں گا

عظیم صدر بالا قدر!

چونکہ ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارا۔ اس لئے ملت کا مجموعی قوام مجھ سے کچھ امیدیں وابستہ کرنے میں حق بجانب ہے۔ اگر آپ نے ایک ننھے منے ستارے سے یہ پوچھ لیا ہے کہ تو ملت کے کون سے تاریک افق پر چمک کر ظلمت کے پردے کو چاک کرے گا تو جواب حاضر ہے۔

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلا دیں گے
چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

میں نے جس آغوش محبت میں شعور کی آنکھ کھولی ہے وہ میری ماں کی مقدس گود ہے۔ وہ میرے پیارے اور عظیم باپ کی شفقت کا دامن ہے۔ مجھے اپنی ماں سے پیار ہے اور اتنا پیار ہے کہ اگر کوئی نابکار مجھ سے میری ماں چھین لے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ وہ ماں جس کے بغیر میرا گھر قبرستان ہے اس نے میری لوریوں میں مادر وطن کے گیت گائے ہیں۔ ان لبوں کے لمس نے میرے گالوں میں صبح آزادی کی ٹھنڈک بھری ہے۔ اس نے بوسے دے دے کر خاک وطن سے میری مانگ بھرنے کے لئے میری جبیں کو بزدلی کے داغ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے صاف کر دیا ہے۔ میرے باپ نے میری رگوں میں مادر وطن پر قربان ہونے والے خون سے مجھے شعلہ جوالہ بنا دیا ہے۔ میں اٹھتا ہوں تو میری ہر اٹھان محمد عربی ﷺ کے حضور ہوتی ہے۔ میں بیٹھتا ہوں تو میری ہر بیٹھک محمد ﷺ کے حضور ہوتی ہے۔ ایسے میں آپ سوچیں کہ میں کیا بنوں گا اور مادر وطن کے لئے کیا کروں گا۔

عالی جاہ!

میں اپنی ماں کی محبت کا امین بن کر اس محبت کی خوشبو سے اس نفرتوں کے جہاں کو معطر و مطہر کر دوں گا۔ میری کاوشوں سے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت سے، حضور پرنور شافع یوم النشور

صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے کرم سے، بزرگوں کی نوازش سے، میرا وطن محبت کا گہوارہ بنے گا۔ محبت کے زمزمے بہیں گے۔ میں کوشش کروں گا کہ اپنی ناتواں ہڈیوں میں ایمان کا چونا ملا کر سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جاؤں اپنے وطن کے دکھیاروں کے دکھ درد کا چارہ بنوں۔ آنے والی نسلیں ان خاروں کے لبوں پر خون کی سرخی دیکھ کر یہ اندازہ لگانے میں یقیناً حق بجانب ہوں گی۔

اپنے دامن کو کیا خون سے تر پھولوں نے
اک میرا دامن کانٹوں سے بچانے کے لئے

حضرات!

شاید میرے وہ بھائی جنہیں یہ درد کی دولت نصیب نہیں ہوئی وہ کہہ اٹھیں کہ یہ ایک پگلے کی بڑ ہے۔ دیوانے کا خواب ہے۔ لیکن میں آپ پر یہ حقیقت واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ تو رب ذوالجلال ہی جانتا ہے۔ کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ البتہ اگر موقع میسر آیا تو میں آپ سے اور رب ذوالجلال سے عہد کرتا ہوں کہ ملک کی نظریاتی، بری، بحری اور فضائی سرحدوں کے دفاع میں خالد کی تلوار بن کر، محمد بن قاسم کی پکار بن کر، طارق بن زیاد کی للکار بن کر، اپنے دشمن پر ٹوٹ پڑوں گا۔ میری ہر جھپٹ میں غزنوی کی سرعت ہوگی۔ سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کی تڑپ ہوگی۔ ایم ایم عالم کی ہمت اور پھرتی ہوگی اس جوش میں ہوش کا دامن میرا حرز جاں ہوگا۔ کمین دشمن کی طرح عورتوں، بچوں بوڑھوں اور فصلوں کی تباہی نہیں کروں گا۔ بلکہ محمد عربی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دامن رحمت کی لپیٹ میں لے لوں گا۔ فصلوں پر ابر رحمت بن کر برسوں گا۔ عورتوں کی عفت کی چادر بنوں گا اور بوڑھوں اپاہجوں کی لاٹھی بنوں گا۔

زمین والو! زماں والو! یہاں والو! وہاں والو! گواہ رہنا ہاں گواہ رہنا کہ مشکل ہے بہت کام مگر کر کے رہوں گا۔

راہ وفا میں ہر سو کانٹے دھوپ زیادہ سائے کم
لیکن اس پر چلنے والے خوش ہی رہے پچھتائے کم

ایٹمی توانائی میں خودکفالت پاکستان کی بقا کی ضامن ہے

حضرات محترم!

اردو انسائیکلو پیڈیا نے ایٹمی توانائی (Atomic energy) کی تعریف کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ ایٹمی توانائی وہ قوت ہے جو بنیادی طور پر حرارت کی صورت میں یورینیم یا کسی دیگر بھاری دھات کے ایٹموں کے انشقاق سے حاصل ہوتی ہے۔

(حوالہ صفحہ ۱۶۳ کالم ۱)

ترقی یافتہ ممالک میں آج کل ایٹمی توانائی سے بجلی حاصل کی جارہی ہے۔ کوئلے کی جگہ ایٹمی ایندھن کو مختلف مقاصد کے لئے استعمال میں لایا جارہا ہے۔ تجربات سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ سورج کے اندر ہائیڈروجن کے ایٹم کاربن اور نائٹروجن کی مدد سے ہیلیم میں تبدیل ہورہے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آفتاب کی سطح پر درجہ حرارت دس ہزار درجے فارن ہائٹ اور اس کے مرکز کا کئی لاکھ درجے ہے۔ اندازہ لگایا گیا ہے کہ سورج میں ہر سیکنڈ میں چالیس لاکھ ٹن مادہ قوت کی شکل میں تبدیل ہورہا ہے۔ اب اس بے پناہ توانائی کو زمین پر بروئے کار لانے کے لئے تجربات کئے جارہے ہیں۔ اور کارخانوں کو چلانے اور مکانات کو گرم رکھنے کیلئے استعمال کیا جارہا ہے۔ ترقی پذیر ملک کی حیثیت سے تو ہمیں ہر اعتبار سے خودکفیل ہونے کا بھی پورا پورا حق ہے۔ لیکن بحیثیت مسلمان ذات باری تعالیٰ کا ارشاد بھی ہمارے پیش نظر رہے تو بھی ہمیں ہر اعتبار سے دشمن کے دانت کھٹے کرنے کے لئے ہمہ وقت تیار رہنے کا حکم ہے۔

حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کہا ہے کہ

عصا نہ ہو تو کلیمی ہے کار بے بنیاد

اندرونی و بیرونی مسائل، پریشانیوں اور دشمنوں کی سازشوں سے نبرد آزما ہونے کو

بنیان مرصوص کی شکل ہر جدید ٹیکنالوجی سے آراستہ ہونا نہ صرف ہمارا حق ہے بلکہ ہماری ضرورت بھی ہے اور ضرورت بھی ایسی کہ اس کے بغیر آج کے دور میں آزادی کا سانس لینا بھی مشکل ہے۔ آزادی کی بقا، پاکستان کی بقا اور بحیثیت ایک مسلمان اور پاکستانی کی بقا خدائے بزرگ و برتر اس کے رسول ﷺ کی رسالت پر ایمان کے ساتھ ساتھ اسباب پر نظر رکھتے ہوئے ایٹمی توانائی میں خود کفالت کے بغیر پاکستان کی بقا کی کوئی ضمانت نہیں۔

حضرات گرامی!

ترقی پذیر ممالک میں پاکستان سرفہرست ہے اس کا اپنی ترقی اور بقا کے لئے ایٹمی توانائی میں خود کفیل ہونا ازبس ضروری ہے۔ ہمارے کوئلے کے ذخائر اتنے زیادہ نہیں ہیں کہ مستقل بنیادوں پر اس سے امیدیں استوار کی جائیں۔ تیل کی کشیدگی کی رفتار بھی زمانے کی رفتار سے بہت ست ہے۔ ان کے علاوہ ذرائع توانائی کا حصول ایک ترقی پذیر ملک کے لئے امر واجبی ہے۔ پن بجلی گھر اس کی ابتدائی شکل ہیں۔ اس سے بمشکل چند کلوواٹ بجلی کا حصول ممکن ہے۔ البتہ ایٹمی ہتھیار اسلحہ اور دیگر ایٹمی سائنسی امور میں تحقیقات اور ترقی کے لئے وسیع پیمانے پر خود مختاری و خود کفالت پاکستان کا حق ہے۔ بری، بحری، فضائی میدانوں میں جہازوں ٹینکوں آبدوزوں اور بحری جہازوں میں استعمال کرنے اور ان کی تکنیکی قوت میں اضافہ کرنے اور جدید آلات اور ایندھن سے آراستہ کرنے کے لئے بھی ایٹمی توانائی میں خود کفالت بہت ضروری ہے۔

صدر محترم!

دنیا شاہد ہے۔ کہ دیگر ممالک اس ایٹمی توانائی کی جدید شکل کو اپنی ایٹمی قوت بنا چکے ہیں اور اس سے اپنی طاقت کا لوہا منوا رہے ہیں اور ترقی یافتہ ممالک ترقی پذیر ممالک میں ان کی ضرورت کے تحت انگڑائی کو بھی خطرہ سمجھتے ہوئے قدغن لگا رہے ہیں۔ جو سراسر ناانصافی ہے۔

ناموری حاصل کرنے کیلئے محنت کی نہیں دولت کی ضرورت ہے (منفی خیالات)

یہ ناداری سراسر ایک غم ہے
اسی سے ناک میں مفلس کے دم ہے
اگر کوئی سفارش ہو میسر
غریبی سے امیری دو قدم ہے

صدر محترم اور حاضرین گرامی!

ابھی تھوڑی دیر مجھ سے پہلے ایک زاہد خشک انتہائی مسکین شکل بنا کر واعظانہ کردار ادا کر رہے تھے اور منافق منافق، منافقت منافقت اور سخت محنت کے الفاظ تسبیح کے دانوں کی طرح منکے پر منکا ٹھاہ منکا پھینک رہے تھے۔ بیچاروں کو اتنا بھی پتہ نہ چلا کہ آج کتنے پھیرے دیئے ہیں اور وہ خود بھی کس پھیر میں ہیں۔ دولت کی مخالفت میں اپنے خشک زہد کا پورا زور بھی صرف کر گئے اور میری عالی شان کوٹھی، اعلیٰ ترین کار، احباب کی کثرت، نوکروں کی ریل پیل غرض میری ہر چیز کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ بھی رہے تھے۔

الجھا ہے پاؤں یار کا زلف دراز میں
لو! آپ اپنے دام میں صیاد آ گیا

حضرات محترم!

میں اپنی دولت کے نشے کی ترنگ میں ڈنکے کی چوٹ پر اعلان کرتا ہوں کہ دولت نہیں تو کچھ بھی نہیں۔ میری کوٹھی کی تعمیر میں کئی ایک مزدوروں نے بڑی محنت کی تھی۔ خون پسینہ ایک کر دیا تھا لیکن انہیں کون جانتا ہے۔ بیچارے دولت کے پیچھے مارے مارے پھر رہے تھے۔ باوجود سارا سارا دن محنت کرنے کے شام کو ایک دولت مند کے ہاں ہاتھ پھیلا کر مزدوری کی بھیک بھی مانگ رہے تھے۔ واہ کیا کہنے اس محنت کے۔

میں اپنے شہر کے سوداگروں سے واقف ہوں
کہ جن کا ذہن رسا ہر گھڑی سوال پہ ہے

حضرات محترم!

چوکھٹ زر پر کون سجدہ نہیں کرتا۔ اخباروں، میگزینوں، رسالوں اور پبلشروں کی کتابوں میں دولت ہی کا عمل دخل ہے۔ مذہبی، سیاسی، معاشرتی اور فلاحی امور میں جلسوں، جلوسوں اور میٹنگوں کی کامیابی کسی دولت مند کے بغیر ممکن ہی نہیں، مساجد و معبد، گرجا و کلیسا میں رونق دولت کے دم سے ہے فوجی و عسکری قوتیں دولت کو نظر انداز کر کے دیکھیں۔ آپ نے مجھے اس اسٹیج کا طعنہ دیا ہے بتایئے؟ کیا یہ اسٹیج بغیر دولت کے تیار ہوا ہے۔ یہ عالی شان صوفے، خوبصورت شامیانے، دیدہ زیب قناتیں، صدر ذی وقار کی نفیس ترین کرسی ایک دولت مند کی دولت کی مرہون منت ہے۔

حضرات گرامی!

تاریخ کے اوراق اٹھایئے۔ دولت مندوں نے کیا کچھ نہیں پایا۔ اس سے ملک خریدے، لوگ خریدے، ذہن خریدے، بلکہ ضمیر خریدے۔ دولت والوں کی شہرت اور عزت و عظمت و شان و شوکت کی چکا چوند سے مرعوب ہو کر بڑے بڑے جبہ و دستار کے مالک چوکھٹ زر پر اپنا ایمان بھی پیش کرنے کے لئے آ گئے۔

صبح ہوتے ہی نکل آتے ہیں بازار میں لوگ
گٹھڑیاں سر پہ اٹھائے ہوئے ایمانوں کی

صدر محترم اور حاضرین باتمکین!

اب آخر میں محنت محنت کی رٹ لگانے والوں سے مخاطب ہوں کہ اے علم وفضل پر فخر کرنے والو! اے محنت و مشقت کی چکی میں پھنسے ہوئے لوگو! اور اے جدوجہد اور سعی مسلسل جیسی عظیم مصیبت کے گرفتار دوستو، سنو!

اگر مال و دولت تیرے پاس ہے
تو ہر چیز پیارے تیرے پاس ہے

باہمی تعاون و یک جہتی بہترین جنگی ہتھیار ہے

صدر ذیشان اور ارباب محفل!

آپس میں اتفاق و اتحاد، تعاون و بھائی چارہ زندگی کے ہر میدان میں انسان کا معاشرتی حیوان ہونے کے ناطے از بس ضروری ہے کوئی انسان کسی دوسرے انسان کے تعاون اور مدد و نصرت کے بغیر چند لمحات بھی آسودگی سے نہیں گزار سکتا۔ اگر کوئی شخص خود ہی دانہ کاشت کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ مجھے کسی کی محتاجی نہیں۔ میں آٹا اپنی گندم کا کھاتا ہوں۔ پانی اپنے نل یا کنویں کا پیتا ہوں۔ پارچات اور کپڑے اپنی کھڈی اور اپنے کارخانے کے استعمال کرتا ہوں۔ یہ تصورات لایعنی اور حماقت پر مبنی ہی نہیں بلکہ اس کی خام خیالی اور کور مغزی کی دلیل ہیں۔ ایسے کور مغز سے کوئی پوچھے بھئی آلات کاشت یا آلات کشید آب یا کارخانے اور کھڈی کی بناوٹ بھی کیا تمہاری ہی مرہون منت ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جواب نفی میں ہوگا تو ہم بلا حیل و حجت اس نتیجہ پر پہنچے کہ انسان ایک ایسا معاشرتی حیوان ہے جسے ہر قدم پر دوسرے کی محتاجی ہے غیر محتاج تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے اور بحیثیت مسلمان تو معاشرتی زندگی میں

وَلَا تَعَاوَنُوا عَلَى الْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (المائدہ:2)

کے حکم کے مطابق باہمی تعاون کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے۔

حاضرین باتمکین!

جنگی نکتہ نگاہ سے جہاں صبر و ضبط، جرأت و ہمت ایثار و قربانی اور خلوص و وفا جیسے ہتھیار مجاہد کی زینت ہیں وہاں ان کا آپس میں انس و مروت، پیار و محبت، احساس درد و کرب اور باہمی تعاون و یک جہتی سب سے بڑا ہتھیار ہے۔ اگر فوج اس عظیم نعمت سے محروم ہے تو دنیائے دوں کے موجودہ اعلیٰ سے اعلیٰ اور خوفناک و تباہ کن ہتھیاروں کی موجودگی بھی فوج کو

شکست سے نہیں بچا سکتی۔

صدر محترم!

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ۝ (صف)

کہ یہ ایک حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ ان خوش نصیب مجاہدوں کو پسند کرتا ہے۔ جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر دشمن سے ٹکرا جاتے ہیں۔ گویا اگر فوج متحد اور منظم ہو کر باطل قوتوں سے نبرد آزما نہیں ہوگی تو وہ اسے پیس کر رکھ دیں گے بلکہ اس کی شکست صرف اس کی ذات تک محدود نہ رہے گی۔ بلکہ وہ بلند نظریات جن پہ ساری انسانیت کی فلاح کا انحصار ہے وہ شکست کھا جائیں گے اور یہ اتنا بڑا المیہ ہوگا کہ اس کی تلافی کے لئے سیسہ پلائی ہوئی دیوار از سر نو تعمیر کرنا پڑے گی۔

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بہ خاک کاشغر

صدر ذی وقار اور ارباب فکر و نظر!

تمام درختوں کے ننھے ننھے پتوں کا مل کر زور سے ہلنا آندھی کہلاتا ہے۔ اس آندھی کے جوش کا توڑ ممکن نہیں۔ پانی کے چھوٹے چھوٹے قطروں کا باہمی ربط طوفان آب بن جاتا ہے۔ جو ہر قسم کے خس و خاشاک کو بہا کر لے جاتا ہے۔ حقیر سے حقیر کیڑوں کا حملہ ٹڈی دل کہلاتا ہے۔ ان کیڑوں کا حملہ حضرت انسان اشرف المخلوقات کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ کثیر بے جان اور بے حس و حرکت الفاظ کی یک جہتی انہیں ایک بہت بڑی کتاب کی شکل دے دیتی ہے۔ غرض خدائے بزرگ و برتر کی مخلوق کا وسیع کارخانہ باہمی تعاون و یک جہتی کی بین دلیل ہے۔ یہی تعاون فوجوں کو نصرت و فتح سے ہمکنار کرتا ہے۔ اور جو شخص ایک مجاہد ہونے کے حوالے سے اس حقیقت سے انکار کرے گا۔ اسے آخر میں یہی

کہہ کر جھنجھوڑا جا سکتا ہے۔

میں تم سے پوچھتا ہوں یاد کیوں اس کی مناتے ہو
عمل کے وقت تم جس کی نصیحت بھول جاتے ہو
تمہیں کچھ یاد ہے اس نے کہا تھا متحد رہنا
جماعت ایک ہو تو سہل ہے آفات کا سہنا

قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے (1)

زمانے کا دن رات ہے یہ اشارہ
کہ ہے آشتی میں میرے یاں گزارہ
نہیں پیروی جن کو میری گوارہ
مجھے ان سے کرنا پڑے گا کنارہ

اے مسند صدارت کی رونق اور ارباب محفل!

جب سے کائنات انسانی نے وجود کی خلعت پہنی ہے۔ علم وفن کا چراغ ضوفشاں ہوا ہے۔ عظمت انسانی کو اوج ثریا تک پہنچانے اور مسجود ملائک بنانے میں ن والقلم وما یسطرون کے مقدس دھارے بہتے رہے ہیں۔ صنف مخالف، جہالت، فخر ومباہات، غرور، تکبر اور ظلم و ستم نے بھی تقریباً اسی وقت سے آنکھ کھولی ہوئی ہے۔ باد مخالف خواہ کتنے ہی زوروں سے چلے کوئی نہ کوئی علم کا پروانہ اسے اپنی پرواز کا بہانہ بنا کر آگے بڑھا اور بڑھتا ہی چلا گیا۔ اس کی تندی، اس کی نخوت اور تیزی کا غرور خاک میں ملاتا رہا تلوار تاریخ حیات میں جب بھی چمکی جہاں چمکی اور جس انداز سے چمکی سامان ہلاکت بنی۔ چیخوں، آہوں کے سوا اس کی وراثت کیا ہے۔ محبت والفت تو اس کی لغت میں شامل ہی نہیں ہے۔ جب کہ علم وفضل کا علمبردار قلم اگرچہ کبھی کبھی منفی کردار بھی ادا کرتا رہا ہے۔ لیکن اس کا اکثر استعمال تجسس، تعلیم وتعلم، ترقی وعروج، انس ومروت اور محبت والفت کے لئے ہوا ہے۔ اور دنیا کے عظیم لوگوں نے بھی محبت کو فاتح عالم قرار دیا ہے۔ تلوار کو نہیں گویا ن والقلم یعنی قلم اور دوات ہمیشہ فاتح عالم کے طور پر ابھرے ہیں۔

اے زینت محفل دانشوراں!

یہ مانا کہ تلوار فاتحین کا زیور، بہادروں کا جوہر اور جرأت وہمت کا نشان ہے۔ لیکن چشم

تصور سے یہ حقیقت ایک لمحہ کے لئے بھی اوجھل نہ ہونے پائے کہ تلوار کے سامنے جھکا ہوا سردب تو گیا کٹ بھی گیا لیکن تسلیم کی خو سے آشنا نہ ہوا اور جب بھی موقع ملا اپنی ہزیمت اور شکست کا بدلا لینے کے لئے اٹھا تو قیامت ڈھا گیا پہلے سے کہیں زیادہ خوں آشامیاں اور بربادیاں سامنے آئیں۔ فضاء دہر مغموم ہوئی۔ ماحول سوگوار ہوا۔ مگر قلم کے حضور جھکا ہوا سر ایسا سرنگوں ہوا کہ سرنگوں ہی رہا۔ اس کا فیصلہ نوشتہ دیوار بن گیا۔ حرف آخر ہوا اور تسلیم کئے بغیر چارہ نہ ہوا۔

اگر اک واقعہ ہوتا تو کہتے اتفاق اس کو
مگر لاکھوں سزائیں ہیں سزاؤں کے اعادے ہیں

حضرات باتمکین!

دور حاضر میں تلوار کی جدید شکلیں پسٹل، توپ، گن، کلاشنکوف، ٹینک اور ایٹم بم غرض وہ تمام ہتھیار جنہیں آج استعمال کیا جارہا ہے۔ اگر ان کی تخلیقی کاوشوں پر غور کیا جائے تو یہ بات سامنے آتی ہے کہ ان کا وجود بھی قلم ہی کی نوک کا تراشیدہ ہے۔ کتنے ہی فطین ذہنوں کے خیالات صفحہ قرطاس پر بکھرے، مٹے، ابھرے اور اپنی طاقت کا لوہا منوانے کو ان آلات کی شکل میں سامنے لائے اور سادہ لوح انسانوں نے یہ سمجھ لیا کہ تلوار نے خود بخود جدت طرازیاں اختیار کر لی ہیں۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے پس منظر میں ابھرنے والی طاقت اس طاقت سے کہیں زیادہ طاقتور ہے۔

یہ ہموار سڑکیں یہ راہیں مصفا
درختوں کا دو رویہ گنجان سایہ
نشاں جا بجا میل و فرسخ کے برپا
سر راہ کنویں اور سرائیں مہیا
بہار اب جو دنیا میں آئی ہوئی ہے
یہ قلم و علم نے سجائی ہوئی ہے

اے دور حاضر کے عظیم فرزندو!

وقت کی قلت اس موضوع پر شرح وسط سے گفتگو کی اجازت نہیں دیتی۔ آخر میں میں اپنے خیالات کو مختصر الفاظ کا لبادہ اوڑھاتے ہوئے عرض کرتا چلوں کہ تیغ وتلوار کی طاقت منوانے کے لئے جو روش بھی اختیار کی جائے گی اس کے لئے بھی قلم کا سہارا لئے بغیر چارہ نہ ہوگا۔

اور تو کچھ کہہ نہیں سکتا کیا تھا، کون تھا؟
بات سچی کہنے والا سب کو دیوانہ لگا

قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہے (2)

ساتھ ہمارا کبھی نہ چھوڑا یار قتیل قلم نے
ورنہ اس دنیا میں کس نے کس کا ساتھ نبھایا

اے محفل دانشوراں اور مسند نشین صدارت!

یہ واقعہ شکوک وشبہات سے بالاتر ہے کہ دعوت حق کا قافلہ وادی سینا سے چلے یا فاران کے دامن سے اس کی راہ تلوار کی چھاؤں میں سے ہو کر گزرتی ہے یا مختلف ممالک اور اقوام کو غلام بنانے کے لئے جو ظالمانہ کارروائیاں عمل میں آتی رہیں۔ ان کے گیت لوگوں نے اکثر فخر ومباہات کے ساتھ گائے ہیں بلکہ مغربی اقوام نے ضرب الامثال میں ایک اور مثال کا اضافہ کر دیا جوان کے ذہن کی سفاکی کی غماز ہے۔

(First of all kill him other wise he will kill you)

یعنی پہلے تم ان کو مار ڈالو۔ ورنہ وہ تمہیں مار ڈالیں گے۔ لیکن ان تلخ حقائق وشواہد کے برعکس قلم ہمیشہ سے ایک فاسد اور ظالمانہ نظام جاہلی سے عوام الناس کو نجات دلا کر انصاف اور انس و مروت کا دور جدید پیدا کرتا رہا ہے اور دنیا کے ظالموں اور سفاکوں کو دعوت فکر دیتا رہا ہے۔ کہ اے دنیا کے چنگیز و اور ہلاکو۔ ڈنڈے سے تم سروں پر تو حکومت کر سکتے ہو دل پر نہیں۔

یہ کہہ کر اس بت ظالم نے آنکھیں پھیر لیں مجھ سے
کہ محبت کرنے والا رحم کے قابل نہیں ہوتا

اے دور حاضر کے ذہین فرزندو!

اس ماحول میں چند شخصیات ایسی بھی جلوہ افروز ہیں۔ جو میرے اور آپ کے دلوں کے بادشاہ ہیں۔ شہر یار ہیں۔ حکمران ہیں۔ لیکن ان میں سے تو کوئی بھی تلوار کا دھنی نہیں ہے۔ بلکہ علمی سرمایہ کو ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل کرنے والے، فیضان علم وادب کو

صفحہ ہائے قرطاس پر محفوظ کر لینے والے ماضی کے علوم میں غوطہ زن ہو کر اپنی فکری وتخلیقی صلاحیتوں کے بل بوتے پر علم و دانش کے نئے افق تلاش کرنے والے۔ رومی و رازی جامی و فارابی، ابن رشد وابن حیان، سب انہی اہل علم اور اہل قلم کے مرہون منت ہیں۔ بلکہ میں اور آپ سب انہی کے ریزہ خواروں میں ہیں۔ یہ مسندیں، صدارتیں، یہ شعلہ نواء مقرروں کی تقریریں، مسجدوں کا تقدس محراب و ممبر کی داستانیں، علم و فن کے مراکز قلم کی طاقت کا عنوان ہیں۔ قلم منفی و مثبت دونوں اعتبار سے تلوار سے زیادہ طاقتور ہے۔

اے ارباب فکر و نظر!

تلوار صرف تلوار ہے۔ قلم قلم بھی ہے تلوار بھی۔ تلوار صرف ظلم و بربریت ہے۔ قلم ظلم و بربریت بھی ہے اور امن و آشتی کا پیغام بھی۔ تلوار صرف نفرتوں سے عبارت ہے۔ قلم نفرت بھی پھیلاتا ہے اور محبت کے زمزمے بھی بہاتا ہے۔ تلوار صرف جوش ہے۔ قلم جوش بھی ہے ہوش بھی۔ تلوار کا کام صرف کاٹنا ہے۔ قلم کاٹتا بھی ہے اور کٹے ہوؤں کو جوڑتا بھی ہے۔ تلوار صرف ماضی ہے۔ قلم ماضی بھی ہے حال بھی اور استقبال بھی۔ تلوار صرف زر اور زور والوں کا ہتھیار ہے۔ قلم صرف زر اور زور والوں کا ہی نہیں بلکہ بے زوروں کی ڈھال بھی ہے۔ تلوار چاہتوں خواہشوں اور حرص و آز کی آگ بجھانے کے لئے چلتی ہے۔ حالانکہ قلم کہیں تو خلوص کے لئے بھی ضرور استعمال ہوا ہے۔ تلوار کے استعمال میں فخر کم اور ندامت زیادہ ہے۔ جبکہ قلم کے استعمال میں ندامت کم فخر زیادہ ہے۔ قلم کے اس دو آتشی کردار نے اپنی طاقت کا لوہا ازل سے تا امروز منوایا ہے اور منواتا رہے گا۔

صدر ذیشان!

تاتاریوں نے اپنی تلوار سے اسلامی تہذیب وتمدن کی قلم سے روشن کی ہوئی شمعوں کو گل کرنے کی کوشش کی۔ ظلم و بربریت کے پہاڑ توڑے۔ دریائے دجلہ کا پانی تین دن تک سرخ رہا اور تلوار کے کردار کا ماتم کرتا رہا۔ تلوار کی رستہ خیزیوں اور چیرہ دستیوں کے باوجود افغانستان میں روسی فوج کشی کو منہ کی کھانا پڑی۔ فلسطین و لبنان میں اسرائیلی خون

آشامیوں کا کھیل کھیل کر نفرتوں کے شعلے بھڑکا کر وحدت انسانی کو نا قابل تلافی نقصان پہنچا رہے ہیں۔ امت کا گروہوں اور دھڑوں میں بٹ جانا۔ پھر اس پر انسان کا دل گرفتہ ہونا۔ یہ سب تلوار کے کارنامے دیکھ کر بھی قلم نے اعلان کیا۔

ہزار بار جلا گرچہ آشیاں اپنا
نہ کچھ بگاڑ سکی برق تپاں اپنا

حضرات والا کرم!

صفحہ قرطاس پہ بکھرے ہوئے کروڑوں خطوط امن و آشتی کے پیام بر ہیں اور یہ پیغام کائنات ارضی کی بسیط وسعتوں پہ حاوی نظر آتا ہے۔ بلکہ آخر میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ آج کے دور میں تلوار ہو یا ٹینک، میزائل ہو یا ایف سولہ بذات خود قلم کے محتاج ہیں۔ قلم کے بغیر ان کا نقشہ ان کی بناوٹ اور ان کا استعمال ممکن ہی نہیں۔ زندگی کے ہر میدان میں حملہ ہو یا دفاع قلم کے بغیر کوئی ہتھیار کام نہیں آ سکا۔ اس لئے میرے دوستو، ساتھیو اور بزرگو! محتاج، محتاج الیہ سے ہمیشہ ادنیٰ ہوتا ہے اور یہی اسکی کم طاقتی کی دلیل ہے۔

ساتھ ہمارا کبھی نہ چھوڑا یار قتیل قلم نے
ورنہ اس دنیا میں کس نے کس کا ساتھ نبھایا

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود (1)

نگاہیں جس کی جم جاتی ہیں مستقبل کے چہرے پر
اسے ماضی کے افسانوں کو دہرانا نہیں آتا

اے صدر والا شان اور ارباب بزم!

اللہ تعالیٰ نے دیکھنے کی صلاحیت اور قوت بصارت جس جس کو بھی عطا کی ہے وہ اس سے کام لیتا ہے۔ کائنات کی بسیط و عریض وسعتوں میں پھیلی ہوئی رعنائیاں، دلفریب نظارے، فلک بوس عمارتیں، غربت و افلاس کی غماز، جھونپڑیاں، شاہانہ زمانے کے کروفر، غرباء و فقراء کی کسمپرسی، دیکھنے والا سب کچھ دیکھتا ہے، خوش بھی ہوتا ہے، آنسو بھی بہاتا ہے، فرحت و انبساط کا اظہار بھی کرتا ہے اور دل گرفتہ بھی ہوتا ہے، ظاہر کو دیکھتا ہے اس کی آنکھ ظاہری حسن و قبح کو دیکھتی ہے، متاثر ہوتی ہے لیکن چشم بصیرت رکھنے والے عظیم لوگ جب کچھ دیکھتے ہیں تو وہ فلک بوس عمارت کو ہی نہیں دیکھتے بلکہ اس کے مقاصد، اسباب اور نتائج کو دیکھتے ہیں، وجوہ و علل پر گفتگو کرتے ہیں۔ ایسے ہی واقف اسرار حقیقت اور راز دار قانون فطرت، شاعر مشرق، مصور پاکستان، حکیم الامت علامہ محمد اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی چشم بصیرت سے اعلیٰ عمارات دیکھ کر، امت مسلمہ اور ملت اسلامیہ کو ایک راز سے آگاہ کیا کہ لوگو!

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود
کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

آج ہمیں پھلجھڑی کی چکا چوند خیرہ کرتی ہے، وضع قطع کی زیب و زینت، دعوت نظارہ دیتی ہے حالانکہ آنکھ جو کچھ دیکھ رہی ہوتی ہے وہ ویسا نہیں ہوتا۔ وحدت جمیعت کی تحریکیں وحدت نہیں ہیں بلکہ جمیعت تفریق ہیں۔ لائبریریوں کی کثرت علم نہیں ہے۔ اپنے آپ کو

محفوظ کرنے کے جملہ وسائل سے انسان محفوظ نہیں غیر محفوظ ہوا ہے۔ ہم نے نیکیوں کے جس راستے کو اختیار کر لیا ہے اس کا ثمر کہیں دور تک نظر نہیں آتا۔ آسائشوں کے حصول کا جنون آکاس بیل کی طرح انسان کی سوچ اور اس کے احساس کو اپنی لپیٹ میں لے چکا ہے۔ اس روشنی نے ہماری بینائی چھین لی ہے۔ گلیوں، سڑکوں پر جلنے والے قمقمے روشن نہیں ہیں اور نہ ان سے زمانہ روشن ہو سکتا ہے بلکہ اس روشنی نے تو ہماری بینائی چھین لی ہے۔

آج کل کی روشنی نے کر دکھائے کام دو
گھر کو روشن کر دیا دل میں اندھیرا کر دیا

کیا یہ مقام غور نہیں ہے کہ انسانوں کے اس ہجوم اور سیل بے پایاں کے باوجود ایک پیدا ہونے والا بچہ کس وثوق اور یقین کے ساتھ پیدا ہوتا ہے کہ اگرچہ بہت کچھ ہو چکا ہے لیکن ابھی بہت کچھ ہونا باقی ہے۔ وہ کیا ہونے والا ہے؟ اور کیا ہونا چاہئے؟ اس کی وہ یوں رہنمائی کرتا ہے۔

ملک کس گنتی میں ہے دنیا پہ چھا سکتے ہو تم
گھن گرج، توپوں کی چنگاریں دبا سکتے ہو تم
ہو جو توحید و رسالت پر تمہیں کامل یقین
غم کے طوفان میں گھر کر مسکرا سکتے ہو تم

اے صاحبان علم و فضل!

جو علم، صاحب علم کو سکوں نہ دے اور اس کی ضروریات زندگی مہیا نہ کرے ایسے علم سے نجات کی دعا کرنی چاہئے۔ بیدار کر دینے والا غم، غافل کر دینے والی خوشی سے ہزار بار بہتر ہے۔ میں آپ سے پوچھتا ہوں کیا آنکھ کا نور ہی رہنمائی کے لئے کافی ہوتا ہے؟ اگر ہوتا تو پھر کچھ لوگ خدا سے دل بینا کی طلب کیوں کرتے؟ اس اندھے کا کیا علاج؟ جو قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتا ہے اور اپنے آپ کو اندھا ماننے کے لئے تیار بھی نہیں۔

یقین کیجئے وہ لوگ اندھے ہیں جو سنگ و خشت کے بنائے ہوئے جہان کو جہان تازہ

سے تعبیر کرتے ہیں۔ انہیں کون سمجھائے کہ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوتی۔

اے صدر ذیشان!

آخر ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ازازل تا امروز یہ دستور مسلم ہے کہ انقلاب الفاظ سے نہیں آتے بلکہ نئی سوچ، نئی فکر، نئے تصورات اور نئے جذبات اور پھر ان کے مطابق مسلسل و پیہم عمل سے آتے ہیں۔ تخلیق پاکستان کے وقت سے لے کر آج تک جتنی بھی تحریکوں نے جنم لیا ہے ان کے پس منظر میں یہی اصول کارفرما ہے۔ آیئے علم و عمل اور تجسس و تفکر کی نئی راہوں کے چہروں سے نقاب الٹیں۔ تدبر و تفکر سے، فہم و فراست سے اور دل بینا کی روشنی سے تاریکیوں کے جمود کو توڑ کرنے سے نیا جہان پیدا کریں اور دنیا میں باوقار جینے کا سلیقہ سیکھیں۔

ہم اپنے خون سے صحرا میں گل کھلا دیں گے
چمن میں کون بہاروں کا انتظار کرے

جہان تازہ کی افکار تازہ سے ہے نمود (2)

رنگ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شعلوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

میرے وطن عزیز کے تصور کے خالق ،حضرت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ بیسویں صدی کے آفتاب و ماہتاب ہیں۔ جن کی شاعری میں درس انقلاب ، جدت ، تشبیہات اور استعارات کے سمندر میں لہروں کی سی تڑپ اور سیماب کا سا اضطراب نظر آتا ہے۔ جن سے علم وحکمت اور ذوق آگہی کی کونپلیں ہمہ وقت پھوٹی اور کھلی رہتی ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے۔

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سر آدم ہے، ضمیر کن فکاں ہے زندگی

تاریخ عالم گواہ ہے کہ دنیا میں جتنے بھی مشاہیر ہو گزرے ہیں، انہوں نے شبانہ روز کی محنت ، جہد مسلسل اور عمل پیہم کے ساتھ حالات کی نبض پر اپنی گرفت کو مضبوط رکھا اور محض افکار و تخیل کی بلند پروازیں اور کاغذی گھوڑوں کی ٹاپوں پر انحصار نہ کیا بلکہ تدبیر و سلیقہ شعاری سے حالات کا رخ بدلا۔ تحقیق و تدقیق کے نئے ابواب کھولے۔ تجسس ان کا طرہ امتیاز رہا۔ ذہنی افق ان کی دریافت تھی۔ اقوام عالم کا نقشہ ہمارے سامنے ہے۔ سورج ، چاند اور ستاروں پر کمندیں ڈال کر انہیں زیر دام لا چکے ہیں۔ سمندروں کی اتھاہ گہرائیوں کو کھنگالا جا چکا ہے۔ کوہ و دمن کا دل چیر کر دولت حاصل کرنے کے ڈھنگ آزمائے جا رہے ہیں اور ترقی و عروج اور جہان تازہ کی روئیدگی کی ارتقائی منازل طے کی جا رہی ہیں اور ثابت کیا جا رہا ہے کہ

زندگانی کی حقیقت کوہ کن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

حکم خداوندی ہے:

لَّيْسَ لِلْإِنسَانِ إِلَّا مَا سَعَىٰ ﴿٣٩﴾ (النجم)

یعنی انسان کے لئے وہی کچھ ہے جتنی اس نے کوشش کی۔

ام الکتاب جس کے تمام علوم خشک وتر ظاہری و باطنی ہمارے لئے مشعل راہ ہیں۔ اس میں ارشاد فرمایا:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ أَمْ عَلَىٰ قُلُوبٍ أَقْفَالُهَا ﴿٢٤﴾ (محمد)

یعنی وہ قرآن پاک میں غور وفکر کیوں نہیں کرتے کیا ان کے دلوں پر تالے پڑے ہوئے ہیں۔

اور یہ حقیقت بھی کسی دانشور سے پنہاں نہیں۔

إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ (الرعد:11)

یعنی

خدا نے آج تک اس قوم کی حالت نہیں بدلی
نہ ہو جس کو خیال خود آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

اے ارباب فکر وشعور!

ہم انقلاب حقیقت کے علمبردار محسن انسانیت ﷺ کے ساتھیوں کی زندگیوں کا مشاہدہ کریں تو ہمارے دماغوں کے دریچے یکبارگی کھل جاتے ہیں اور یہ حقیقت ہمیں دستک کی طرح سنائی دیتی ہے کہ حضور ﷺ کے افکار تازہ نے ہی جہان تازہ کی بنیاد رکھی۔ پھر آپ نے ان افکار تازہ میں مزید تدبر و تفکر کی طرح ڈالی اور گویا زبان حال سے ارشاد ہوا!

اٹھ از سر نو دہر کے حالات بدل ڈال
تدبیر سے تقدیر کے دن رات بدل ڈال

آج ہم نے اپنا مستقبل، مغربی آقاؤں کے پاؤں میں کیوں رکھ دیا ہے؟ ان کے اسلحہ، گولہ بارود اور جدید ذرائع نقل وحمل نے ہماری آنکھیں کیوں پتھرا دی ہیں؟ دور حاضر

کے چند بڑے بڑے چوہدری ہم پر کیوں مسلط ہو گئے ہیں؟ بات صرف اتنی ہے کہ ہم نے اپنے اذہان کو کوتاہ اندیشی، غفلت، بے حسی اور طرز کہن پر اڑ جانے کے غبار کی اتنی تہیں ثبت کر دی ہیں کہ ان کے اجلے ہونے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔

آئین نو سے ڈرنا طرز کہن پہ اڑنا
منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں

اب آخر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ ہمارے جہان تازہ کی راہیں کسی ایسے مسافر کے قدم چومنے کے لئے بے تاب ہیں۔کوئی ہے جو سنگ وخشت کی زیب وزینت کے عفریت سے جان چھڑا کر نئے اقتصادی، تمدنی، اصلاحی زاویوں کو سامنے رکھے۔کوئی ہے جو خوشحالی کی دنیا آباد کرے۔کوئی ہے جو افکار تازہ سے جہان نو کی نمود کرے۔سنو! سنو! گوش ہوش سے اس پکار کو سنو! کوئی آگے بڑھے اور بارش کا پہلا قطرہ بن کر ملت اسلامیہ اور خصوصاً پاکستانیوں کے لئے افکار تازہ کی بنیاد رکھے۔

جماعت دہم کے طلبہ کی الوداعی تقریر

قابل صداحترام اساتذہ کرام!

دنیا کی ایک ریت ہے۔ انوکھی بھی، نرالی بھی، تکلیف دہ بھی، سہانی بھی، صبح آنا شام جانا، شام آنا صبح جانا باہر سڑک پر جا کر دیکھیں تو زندگی کی ایک ایک حرکت اس کے پس منظر کی عکاس ہے۔ ان میں چہکتے چہرے بھی ہونگے شکستہ وغمزدہ دل بھی رواں دواں ہوں گے۔ اس دلکش اور دل شکست عمل کا دور دورہ آج ہمارے ادارہ کے اس ہال میں ہے۔ ایک طرف ہال کی پختگی نظر آرہی ہے تو دوسری طرف چہروں کے حال و کیفیت کی شکستگی بھی نظر آرہی ہے۔

اے کرسی صدارت کی رونق!

میرے دل کی دنیا کے حکمران اساتذہ کرام نے ہمیں ایک منزل سے آشنا کیا ہے دراصل ہم نے ان کا دامن صرف اسی لئے تھاما تھا کہ کسی ذکی کیفی کا مشورہ حرز جاں بن چکا تھا کہ

دشت طلب میں تنہا نکلو یا پھر اس کے ساتھ چلو
جس کی ٹھوکر راہ نکالے راہ میں ٹھوکر کھائے کم

راہ علم کے ان عظیم راہنماؤں نے ہمیں آگے بڑھایا ہے۔ آج ہم عہد کرتے ہیں۔ کہ ان کی دکھائی ہوئی منزل پر قبر کی گود تک گامزن رہیں گے۔ ان شاء اللہ اگرچہ آج ان کی جدائی ایک تکلیف دہ عمل بھی ہے۔ لیکن ہم منزل کے تعین پر ان کے شکرگزار بھی ہیں۔ بس ایک آخری التجا ہے۔ کہ ہمیں ہمیشہ اپنی نیک خواہشات اور دعاؤں میں شامل رکھیں۔

گرے ہوؤں کو اٹھانا کمال احساں ہے
وہ کام کر زمانے میں کہ یادگار رہے

بچوں کی ایک خوبصورت تقریب سے خطاب

لاہور شاہینوں کا شہر ہے۔ ان شاہینوں کے چھوٹے چھوٹے اور ننھے منے بچوں کے خون گرم رکھنے کے خوبصورت بہانے دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔ یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی پریوں کے دیس میں آ گیا ہوں۔ اچھلنا کودنا اور کود کر اچھلنا کتنا بھلا لگ رہا تھا۔ ورزش اور کھیل صحت کے لئے اتنے ہی اہم ہیں۔ جتنی وطن عزیز کے لئے غیور اور بہادر نوجوانوں کی ضرورت ہے۔ کھیل کود میں اپنی اپنی صلاحیتوں کے جوہر دکھاتے ہوئے نمایاں کامیابیاں حاصل کرنے والے بچے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ ان کی خوابیدہ صلاحیتوں کو مزید جلا ملے گی اور ان ناتراشیدہ جوہروں کی آب و تاب میں اور نکھار پیدا ہو گا۔ انہی میں کل سرفروش مجاہد، جواں ہمت غازی اور وطن عزیز پر جانیں نثار کرنے والے بھٹی، کئی منہاس اور کئی سرور پیدا ہوں گے ہمیں مستقبل کے ان عظیم معماروں پر فخر ہے۔ میرے بیٹو! آگے بڑھو۔ عظیم منزلوں کے مسافر ہمت کے کوہ گراں ہوتے ہیں۔ جن کے سامنے ہر رکاوٹ پیدا کرنے والا طوفان اپنا منہ خود ہی موڑ لینے پر مجبور ہو جایا کرتا ہے۔

سکول کی کارکردگی کی آواز روز بروز دلنواز ہوتی جا رہی ہے۔ اس کے پس منظر میں کارکنوں کا وہ خاموش مظاہرہ ہے۔ جس کے جوہر کھل کر سامنے آ رہے ہیں۔ مجھے امید ہے۔ کہ یہ سلسلہ اب رکنے نہیں پائے گا۔ ان شاءاللہ۔

اللہ تعالیٰ آپ کو اپنی محنتوں کا صلہ عطا فرمائے۔ (آمین)

اپنی کتابوں اور کاپیوں کی حفاظت

اے میرے ہم مکتب ساتھیو!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ!

میں نے اکثر اپنے ہم جماعت ساتھیوں کو اپنے اساتذہ کرام سے شکایت کرتے سنا ہے۔ کوئی کہتا ہے سر میری کتاب کھوگئی ہے۔ کوئی صاحب کہتے ہیں میں نے اپنی کاپی بستے میں رکھی تھی کسی نے نکال لی۔ غرض ایک ربڑ سے لے کر بستے کے گم ہونے تک اکثر شکایات اساتذہ کرام کے سننے میں آتی ہیں۔ لیکن اگر ہم غور کریں تو ساری کوتاہی ہماری اپنی ہے۔ اپنی چیزوں سے غفلت کوئی اچھی بات تو نہیں۔ کئی بار ایسا ہوا کہ ہم چیز رکھ کر بھول گئے۔ اور نام دوسرے کا لگا دیا۔ اسی طرح یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک دوست کوئی چیز مانگ کر لے گیا اور ذہن میں نہ رہی اور کہہ دیا کہ قلم کھوگیا، کاپی گم ہوگئی۔ وغیرہ وغیرہ۔ غرض اگر ہم اپنی ہر چیز نگاہ میں رکھیں اور ان کی حفاظت کریں تو کوئی وجہ نہیں کہ چیزیں گم ہوں بزرگوں کا کہنا ہے کہ پہلے اپنے گھر کی چار دیواری بلند کرو۔ چور کا راستہ بند کرو۔ پھر اگر چور آئے تو اس کی پٹائی کرو۔

میرے ساتھیو!

میرے وہ ہم مکتب و ہم مدرسہ طالب علم جو ایک دوسرے کی چیزیں اٹھاتے ہیں وہ میرے سکول کے معاشرے کی کالی بھیڑیں ہیں۔ وہ تالاب کی گندی مچھلیاں ہیں وہ طالب علم نہیں طالب زر ہیں۔ وہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کو دعوت دیتے ہیں۔ اسلامی معاشرے میں چور کے ہاتھ کاٹنے کا حکم ہے۔ اس لئے ایسوں کو تلاش کرو استاد محترم کی خدمت میں پیش کرو میں بھی محترم رئیس مدرسہ سے التجا کروں گا کہ ایسا ناپاک شخص جو چوری کے الزام میں آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے اسے پیار محبت سے سمجھائیں پھر اس پر کڑی نگاہ رکھیں اور اگر بار دگر اس جرم کا ارتکاب کرے تو اس گندی مچھلی سے سکول کے تالاب کو پاک کر دیا جائے۔

کہ خس کم، جہاں پاک

وفاداری بشرط استواری اصل ایمان ہے

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

صدر ذیشان اور حضرات باتمکین

زیب سخن موضوع اپنی صداقتوں کے اعتبار سے کائنات کی وسعتوں میں پھیلے ہوئے نظم ونسق کو تسلیم طے کرنے پر مجبور ہو چکا ہے۔ رب ذوالجلال کا ارشاد ہے اس کی اہمیت پر مہر تصدیق ثبت فرماتا ہے۔'' فَاِذَا عَزَمْتَ فَتَوَکَّلْ عَلَى اللّٰهِ'' جب تم کسی کام کا ارادہ کرلو۔ تو یقین محکم کے ساتھ عمل پیرا ہو جاؤ۔ اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا '' وہ لوگ جو تسلیم کی خو کو اپناتے ہوئے استقامت پذیر ہو جاتے ہیں۔ تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ ان کی تائید ونصرت کے لئے آسمان سے فرشتوں کا نزول ہوتا ہے۔ باقی رہی محبت کی بات۔ ہاں ہاں وہ تو واقعی فاتح عالم ہے۔ انس وحروف تو خونخوار درندوں کو بھی رام کر دیتی ہے۔ محبت والفت کے خالی قولی اور جھوٹ موٹ کے بول ذرا بول کر تو دیکھو۔ اور اگر یہی پیار محبت حقیقت کا جامہ پہن لے ایمان راسخ کا روپ دھار لے تو کائنات کی بسیط وسعتیں قوموں سے لپٹنے کو بیقرار ہوں گی۔

حضرات باوقار!

کسی نے کہا تھا کہ دینے والے نے زندگی دے کر ہم غریبوں سے دل لگی کی ہے۔ لیکن میں اسے مقولے کو حرف غلط کی طرح مٹانا چاہتا ہوں۔ کھوٹے سکے کی مانند ٹھکرانا چاہتا ہوں۔ زندگی نعمت رب جلیل ہے۔ احسان خداوندی ہے۔ اس کے دیبار موتیوں کی حامد ہے۔ لیکن یہ موتی اس کے تاج مں سجتے ہیں۔ جو انہیں کا ننا اپنا حق سمجھتے ہیں۔ اور اس کے لئے مسلسل جہاد کرتے ہیں۔ جہاد نام سے گولہ وبارود کی جنگ نہیں۔ نیزہ ڈھال مراد نہیں۔ تیر وفرنگ سے عبادت نہیں۔ بلکہ جہاد زندگی یقین محکم عمل پیہم اور محبت، مروت سے

عبارت ہے۔

صدر ذی وقار

داستان حسن جب پھیلی تو لامحدود تھی اور جب سمٹی تو تیرا نام ہو کر رہ گئی۔ کے مصداق اس داستان حسن کو اپنے الفاظ کے اختصار میں سمیٹنا چاہتا ہوں۔ کہ

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اے محفل صدارت کی رونق اور ارباب بزم!

الجھے ہوئے حالات، بکھری ہوئی فضائیں، بے چینی و بے قراری کا ماحول، بدامنی و بربادی کی کیفیتیں، بے حسی اور بے بسی، ادب واحترام کے جذبات سے ناآشنائی، احساس ذمہ داری کا فقدان جب اس قسم کے حالات کا ہر طرف دھواں اور غبار پھیلا ہوا ہو۔ تو دل گھبرا جاتا ہے۔ کہ شاید اب سکون وچین کے لمحات میسر نہیں آئینگے۔ شاید اب کوئی پھول ایسا نہیں کھلے گا۔ جو چمن کی فضا کو معطر کر دے۔ شاید اب کوئی ایسا ساز نہیں بجے گا۔ جو ماحول کی اداسی میں رنگ بھر دے۔ شاید اب کوئی ابن قاسم، کوئی طارق بن زیاد، کوئی محمود یا کوئی ایاز پیدا نہیں ہوگا۔ جو مایوسیوں کی اتھاہ گہرائیوں سے نکال سکے۔ لیکن کوئی نہ کوئی ایسا واقعہ یا حادثہ رونپذیر ہو جاتا ہے۔ کہ اچانک کہیں سے امید کی کرن چمکتی ہے۔ اور ساری مایوسیاں چھٹ جاتی ہیں۔ چشمہ حیرت کھلی کی کھلی رہ جاتی ہے کہ اے مولا! ایس چنگاری بھی کیا میری خاکستر میں تھی شاید ایسے ہی کسی تجربے پر علامہ اقبال مرحوم جو نباضِ وقت تھے کہا ہوگا کہ

نہیں ہے ناامید اقبال اپنی کشت ویران سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

حضرات محترم!

پاکستان معرض وجود میں آنے سے پہلے انگریزوں اور ہندوؤں کی ملی بھگت سے مسلمان تو خواب غفلت میں غرق تھا۔ کیا کوئی ایسی صورت نظر آتی تھی کہ وہ ظالم وشاطر انگریز جس کی حکومت میں سورج غروب نہ ہوتا تھا اس کی غلامی کی زنجیروں سے کبھی نجات مل سکے گی۔ کبھی ایسا ہو سکے گا کہ یہ طوق غلامی کٹ جائے۔ کیا کوئی اس قفس کی تیلیاں ٹوٹنے کا تصور کر سکتا تھا۔ جائیدادیں ضبط ہوئیں، کاروبار تباہ ہوئے سات سو سالہ حکومت چھن گئی۔

اپنے بکنے لگے، بیگانے لوٹنے لگے، جہالت کی عمیق گہرائیوں میں ڈبو دیا گیا اور کوئی ستارہ کہیں صبح آزادی کا طلوع ہوتا نظر نہ آتا تھا۔ کہ اسی مٹی سے چند زرخیز ذرے ایسے نکھر کر سامنے آئے جن کے متعلق کوئی کبھی سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ لیکن وہ ذرے چمکے، ابھرے اور سارے عالم میں چھا گئے۔ ظالموں کے ظلم وستم کے دانت کھٹے ہو گئے۔ سوئی قوم کو اٹھایا۔ قریہ قریہ، کوچہ کوچہ، بستی بستی گھومے اور اپنا درد ہر شخص کے دل میں بھر دیا۔ انہی چند اشخاص نے اس مٹی کو ذرا نم دیا۔ تو پتہ چلا کہ جس زمین کو ہم مردہ سمجھتے تھے۔ وہ تو بہت زرخیز ہے۔

یہ سحر جو کبھی فردا ہے کبھی ہے امروز
نہیں معلوم کہ ہوتی ہے کہاں سے پیدا
وہ سحر جس سے لرزتا ہے شبستان وبود
ہوتی ہے بندہ مومن کی اذان سے پیدا

صدر محترم!

قیام پاکستان کے بعد معمار اول قائداعظم محمد علی جناح اور ان کے ساتھی جنہوں نے مردہ قوم کو پھر سے زندہ کیا تھا۔ جب وہ چل دیئے تو قوم پھر سو گئی۔ یہ زمین پھر مردہ ہو گئی اور ہر طرف مایوسیاں چھانے لگیں۔ کہ ختم نبوت کی تحریک میں اس مردہ زمین میں چند ذرے ایسے ابھرے کہ حساس دلوں کو اپنی مایوسیوں پر شرمندگی ہونے لگی۔ کہ ایسا نہیں۔ بلکہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

اے ارباب محبت والفت

جب بھی کبھی وطن عزیز پر یا ملت اسلامیہ پر کٹھن گھڑی آتی ہے کبھی نظام مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کی صورت میں، کبھی بابری مسجد کے خلاف احتجاج کی صورت میں اور کبھی تحریک آزادی کشمیر کے روپ میں اس مردہ زمین سے ذرے ابھرتے رہے ہیں۔ مایوسیاں چھٹتی رہی ہیں۔ نئے افق چمکتے رہے ہیں۔ ہر خزاں کے بعد بہار آتی رہی ہے۔ ہر رات کے بعد دن طلوع ہوتا رہا ہے۔ مگر غبار سے اٹی ہوئی فضا چھٹتی رہی ہے۔ بادل برستے رہے ہیں۔ اور مردہ زمین سے زرخیزی پیدا ہوتی رہی ہے۔ اور ہر موسم میں کلیاں نکھرتی رہی ہیں۔

پھول کھلتے رہے ہیں اور حساس دلوں کو احساس دلاتے رہے ہیں کہ

بشر بے چین ہو تو انقلاب آیا ہی کرتا ہے
گلوں کے داغ دھونے کو سحاب آیا ہی کرتا ہے

اے ارض وطن کے ذہین فرزندو!

سنو! آج بھی اس ماحول میں اگر چہ مایوسیوں کا راج ہے۔فضا گرد آلود ہے۔خزاں نے اپنے سائے پھیلائے ہوئے ہیں۔لیکن انشاءاللہ ضرور ایسا وقت آنے والا ہے۔کوئی ستارہ صبح ضرور طلوع ہوگا۔کوئی ذرہ ضرور پھر چمکے گا۔کوئی پھول ضرور پھر کھلے گا اور ساری دنیا پھر پکار اٹھے گی کہ

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

اچھا ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل

صدر ذی شان اور ارباب فکر ونظر

اللہ تعالیٰ کی ساری مخلوق میں صرف حضرت انسان ایک ایسی مخلوق ہے۔ جو صاحب عقل وشعور مخلوق ہے۔ فرشتے ہوں یا غلمان حور قصور ہوں۔ چرند، پرند ان میں حواس خمسہ موجود ہیں۔ جن سے وہ کچھ نہ کچھ اپنے بیگانہ اچھے برے۔ نیک و بد اور دشمن و دوست میں تمیز کر سکتے ہیں۔ لیکن ان کے پاس عقل نہیں ہے۔ عقل صرف حضرت انسان کو تفویض کی گئی ہے۔ اور اس کے ساتھ دل کی دولت بھی مرحمت کی گئی ہے۔ دل کی دولت کے ساتھ ساتھ اگر عقل کی دولت نہ ملتی۔ تو یہ بھی فرشتہ ہوتا۔ یا حیوان، کہ دل صرف تڑپنا جانتا ہے۔ یا پھر الجھنا جانتا ہے۔ عقل اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ کہ اے چل یوں تڑپنے اور الجھنے سے مسائل حل نہیں ہوتے۔ بلکہ عقل سے کام لو۔ اور اس تڑپ اور الجھن کا حل تلاش کرو۔ یہی عقل ہے۔ جو انسان کو بصیرت اور بصارت بخشتی ہے۔ اس لئے علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے مشورہ دیا ہے دل کے ساتھ عقل کا پاسبان بہت ضروری ہے۔

تباہی جب بہت کچھ دل کی ہولی
تو عقل مصلحت اندیش بولی
کہ اے دل وصل جاناں کا طریقہ
نہ لاٹھی ہے نہ پتھر ہے نہ گولی

صدر ذیشان

ابھی کچھ لوگ کہتے ہوئے نظر آئیں گے۔ جو کہیں گے کہ اقبال نے یہ بھی مشورہ دیا ہے۔ کہ کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے۔ تو ہم بھی کہتے ہیں۔ کہ کبھی کبھی تو اسے تنہا چھوڑا جا سکتا ہے۔ مستقل طور پر نہیں۔ دل کی دنیا پر عقل کی حکمرانی نہ ہو تو اس دنیا میں اندھیرا پڑ جائے۔

اے ارباب محفل!

ذرا مجھے آپ بتایئے وہ کون سادل ہے جس نے دنیا کے مسائل یں سے کوئی مسئلہ حل کیا ہوا۔ کوئی عقدہ کھولا ہو۔ یہ سارے امور اور ان امور میں چھپے ہوئے راز کھولنا صرف عقل کے حصہ میں آیا ہے۔

آسمان کی بلندیوں پر پہنچنے کے راستے عقل نے تلاش کیۓ زمین کی پنہائیوں میں چھپے ہوئے خزانوں تک عقل پہنچی، فضا کی بسیط وسعتوں پر عقل چھائی ہوئی ہے۔ کتابوں، سکولوں، کالجوں پر عقل کی حکمرانی ہے۔ دین دنیا کی بہتری کی راہ عقل سمجھاتی ہے۔ دل تو ایک لوتھڑے کا نام ہے۔ اس نے بڑا کام کیا تو کسی کے نازنخروں پر ڈھیر ہوگیا۔ اور کیا۔ لہٰذا میں اس ایوان میں اس قرارداد کے حق میں ووٹ دیتے ہوئے بہ بانگ دہل اعلان کرتی ہوں۔ کہ عقل کو ادھر ادھر بھٹکنے کیلئے کھلا نہ چھوڑا جائے۔ بلکہ اس پر عقل کا پاسبان بہت ضروری ہے۔

ہے جرم ضعیفی کی سزا مرگ مفاجات

معاشرے میں ہزاروں افراد ایسے مل جاتے ہیں جنہیں اپنی صلاحیتوں کی خبر نہیں ہوتی اور کئی افسران ایسے دیکھے گئے ہیں جو اپنے اختیارات کی خبر رکھنے کے باوجود ان کو استعمال کرنے کی صلاحیتیں نہیں رکھتے ایسے افراد یا افسران کا حشر بھی ہمارے سامنے ہوتا ہے ایسے افراد جو معاشرے میں کوئی مقام نہیں رکھتے انکا علم انکے کسی کام نہیں آتا انکی طاقت کے کہیں جوہر نہیں کھلتے وہ زور قلم سے یا زور زبان سے اپنا مافی الضمیر بیان کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ ایسے لوگوں کا جینا بھی کیا جینا جب وہ معاشرے میں اپنی ناقدری دیکھتے ہیں کہ صاحب علم وبصیرت ہونے کے باوجود کسی محفل وتقریب میں دعوت نہیں ملتی۔ محلے میں کوئی ان سے راہ روشنی طلب نہیں کرتا کوئی انکے منصب کی قدر نہیں کرتا وہ ایسے حالات میں جیتے جی مر جاتا ہے۔ اس جرم ضعیفی کی سزا کا قدرتی اصول بھی یہی ہے۔ کہ ایسے شخص کی زندگی بے کار محض ہے انکا مر جانا ہی بہتر ہے۔ وہ جی کر کرے گا کیا اس کے جینے سے کسی کو کوئی فائدہ ہوسکتا ہے جو چیز کارآمد نہیں ہوتی وہ گھر میں سجانے کیلئے بھی نہیں رکھی جاسکتی اسے اٹھا کر کہیں کباڑ خانے میں پھینک دیا جاتا ہے اس طرح وہ افسران جو اپنے اختیارات کی خبر نہیں رکھتے یا ان اختیارات کو استعمال کرنے کی جرات وہمت نہیں رکھتے انکی دفتر میں بے چارگی دیکھا کیجئے دفتری نظم وضبط کا حشر دیدنی ہوتا ہے۔ ماتحت عملہ کی چاندی ہوتی ہے وہ اپنی من مانی کرتے ہیں انہیں خبر ہے کہ افسر بدھو ہے۔ اسے کچھ خبر نہیں اگر ذرا کہیں اس نے سختی کی بھی تو اس کا جواب ہڑتال یا عدم تعاون سے ملتا ہے۔ گویا وہ اپنے اختیارات استعمال نہیں کرسکتا ہے اس کی بے قدری وبے چارگی قابل رحم ہے اس کی بے چارگی اسے کہتی ہے اے مجبور بے بس وبے کار انسان تیرا اس دنیا میں کیا کام ہے تو کیوں زندہ ہے تیری اس بے کار زندگی سے موت بہتر ہے۔

جب حضرت انسان کو اپنی قدر ومنزلت کا احساس ہو جاتا ہے کہ وہ کیوں ہے کیا ہے پھر

اس کا جینا قابل رشک و قابل فخر ہے اس شیر کی کیا زندگی جسے پتہ ہی نہ ہو کہ وہ شیر ہے اور پورے جنگل کا بادشاہ ہے اور پھر گیدڑ بھیڑیئے سے ڈرتا پھرے شیر اس کو کہنا چاہئے جو واقع شیر ہو شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔ حضرت انسان جسے علم ہو جائے کہ اسے بنی آدم کا تاج پہنایا گیا جسے

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ۝ (التین)

جس کیلئے کائنات کی ہر چیز بنائی گئی۔

فرشتہ مجھ کو کہنے سے میری توقیر گھٹتی ہے

میں مسجود ملائک ہوں مجھے انساں ہی رہنے دو

جب حضرت انسان میں احساس بیداری پیدا ہو جاتا ہے تو پھر جیتا ہے تو ایسے جیتا ہے جیسے جینے کیلئے اسے بنایا گیا ہے اس کا جینا قابل رشک و قابل فخر ہے زیب موضوع میں بھی یہ بات واضح ہے کہ ضعیف و ناتواں بن کر جینے سے مرجانا بہتر ہے۔

قبرستان اور غاصبانہ قبضہ

ہم بدلتے ہیں رخ ہواؤں کا
آئے زمانہ ہمارے ساتھ چلے
حیات لے کے چلو کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

معزز حاضرین جلسہ!

قرآن مقدس میں ارشاد ہوتا ہے کہ خدا اس قوم کی حالت کبھی نہیں بدلتا جس کو اپنی حالت بدلنے کا خیال خود نہ ہو۔ زندہ قوم وہ ہوتی ہے جو اپنے اسلاف کی روایات کی پاسدار ہو۔ اپنے ماضی سے سبق لے کر حال کو بہتر کریں اور مستقبل کے لئے بہتر منصوبے بنائیں! اپنے اردگرد ہونے والی تبدیلیوں کو محسوس کریں۔ زندہ قوم کے لوگ منفی تبدیلیوں پر ردعمل کا اظہار کرتے ہیں۔ اپنے اردگرد ہونے والے کسی بھی طرح کے ظلم کے خلاف اٹھنے والا ہاتھ ایک زندہ قوم کے شہری کا بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن جب قوم سوئی ہوئی ہو۔ اپنے ماحول سے یکسر بے خبر ہو۔ آرام طلبی میں پڑی ہوئی ہو۔ ماضی کو فراموش کر چکی ہو۔ حال پر توجہ نہ ہو۔ مستقبل کا فکر نہ ہو۔ جسم زندہ ہوں۔ ضمیر مر چکے ہوں۔ جسموں میں حرارت نہ ہو۔ جذبات میں ہلچل نہ ہو۔ لہو میں امنگ نہ ہو۔ اندھیرے میں اس خیال سے سفر کیا جا رہا ہو کہ منزل مقصود تک دل کا دیا خود ہی لے جائے گا۔ ایک دوسرے پر الزامات، آپس کے اختلافات، دائمی عادات بن چکی ہوں تو ایسی قوم کے لئے کوئی اہل درد کہتا ہے۔ کہ

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کر دے
کہ تیرے کی موجوں میں اضطراب نہیں

سنو لوگو!

آج وہ طوفان برپا ہو گیا، آج وہ ظلم ہو گیا، کروڑوں کی زمینوں کا فراڈ کرنے والوں کا

جی نہ بھرا تو انہوں نے چاند ماریوں سے قبرستان کو گھیرے میں لے لیا قبرستان کا تقدس پامال کر دیا گیا۔ اور اسی پر بس نہ کی گئی۔ بلکہ قبرستان کے اردگرد دیوار زیر لب چن دی گئی جس کے نتیجے میں کچھ قبریں زیر دیوار آ گئیں۔ جب قبروں کو منہدم کیا گیا تو ایسا لگا کہ زندہ مسلمانوں کو دیواروں میں چنا جا رہا ہے۔ ایسا ظلم نہ پہلے کہیں دیکھا نہ سنا۔ اس ظلم پر قبرستان کے پتھر بھی رو پڑے۔ پرندوں نے چیخ و پکار کی درختوں نے دھائی دی۔ اہل القبور نے مدد کے لئے پکارا۔ لیکن یہ آنسو، یہ چیخ و پکار، یہ دھائیاں، یہ آہ و زاریاں وہی سن اور محسوس کر سکتا ہے۔ جس کا درد مند دنیا سے اہل محبت کی عطا سے شہر خاموشاں میں رہنے والوں کی وفا سے رشتہ قائم ہے۔ اہل درد کے دل خون کے آنسو رو رہے ہیں۔ مگر ظالموں نے کچھ نہ سنا اور لمبی دیوار چن کر قبرستان کو جانے والا آسان راستہ بھی بند کر کے کہیں اور تبدیل کر دیا پوچھتا ہوں کیا یہی ظلم کم تھا۔ کہ قبرستان کے احاطے میں گولیوں کی گونج سنائی دے۔ لیکن اب ہمیں ہمارے مذہبی حق سے محروم کیا جا رہا ہے۔ مذہبی اقدار کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ یہ ظلم نہیں تو کیا ہے اور اگر یہ ظلم دیکھ کر بھی ہمارے بحر کی موجوں میں اضطراب پیدا نہ ہو ہمارے سینوں میں دلوں کی دھڑکنیں تعبیر نہ ہو جائیں، ہمارے لہو کی گرمی بڑھ نہ جائے، ہمارے ہاتھ اس ظلم کو روکنے کے لئے آگے نہ بڑھیں تو ہمیں مسلمان کہلانے کا کوئی حق نہیں۔

دیکھنا یہ حبس کا عالم رہا تو ایک دن
اک بگولا آئے گا سب کچھ اڑا لے جائیگا

آج ہمارے نوجوان کیرم کلبوں میں سارا سارا دن ضائع کر سکتے ہیں۔ شام کو ہوٹلوں میں بیٹھ کر ٹی وی پر فلمیں دیکھ سکتے ہیں۔ بس سٹاپوں پر بے مقصد کھڑا ہو سکتے ہیں۔ تو کیا اپنے آباؤ اجداد کی آخری آرام گاہوں کا تقدس بحال کرنے کے لئے آگے نہیں بڑھ سکتے۔ ہمارے بزرگ تو آپس کے اختلافات ہی سے فارغ نہیں ہوئے۔ میں اس کالونی کے عزت مند نوجوانوں سے مخاطب ہوں کہ اب جبکہ ہماری فوجوں نے بجائے آزادی کشمیر کی جدوجہد کرنے کے قبرستانوں کی بے حرمتی کرنا شروع کر دی ہے تو وقت آ گیا ہے کہ ہم نوجوان آگے بڑھیں اور ثابت کر دیں کہ اگر نور الدین زنگی، روضۂ اطہر کی حرمت کی خاطر

جان ہتھیلی پر رکھ سکتا ہے تو ہم بھی اتنے گئے گزرے نہیں کہ اپنے بزرگوں کی قبروں کی حفاظت نہ کرسکیں۔ ہم اتنے بے غیرت نہیں کہ اپنے اسلاف کی روایات کو بھلا دیں اور ان ظالموں کو کھلم کھلا قبروں کی بے حرمتی کی اجازت دے دیں۔ آؤ۔ آگے بڑھو اور ان کو بتا دو۔ کہ ہم میں سے ہر ایک ان کے لئے نورالدین زنگی ہے۔

چلو مل کے فروزاں کریں وفا کے چراغ
کہ ظلمتوں نے کبھی تو اجالا ہونا ہے

حاضرین جلسہ!

تاریخ شاہد ہے کہ جب جب ظلم نے پر پھیلائے۔ زندہ قوموں نے اسے روکنے کے لئے ہاتھ اٹھائے۔ زندہ قومیں کبھی بھی سامان ضرب وحرب کا خیال نہیں رکھتیں۔ وہ جدوجہد کرتی ہیں۔ آج ہمیں بھی یہی کرنا ہے۔ کیا اس 70 ہزار کی آبادی میں 70 نوجوان بھی ایسے نہیں جو اس ظلم کو روکنے کے لئے آگے بڑھ سکیں۔ اگر ہم اپنے اسلاف کی عظمت کی حفاظت نہیں کر سکتے۔ تو ہماری جوانیاں بے کار ہیں۔ غیرت مند آگ سے نہیں ڈر سکتے۔ وہ کشتیاں جلا دیتے ہیں۔ بے دھڑک آتش نمرود میں کود پڑتے ہیں۔ وہ آگے بڑھنا جانتے ہیں۔ پیچھے مڑ کر دیکھنا ان کا شیوہ نہیں ہوتا۔ آؤ میرے ساتھ، کشتیاں جلا دو، آگ میں کود پڑو، سڑکوں پر نکل آؤ، متحد ہو جاؤ، ہاتھ کی پانچ انگلیاں نہ بنو۔ ایک ہو کر آہنی مکا بن جاؤ۔ یاد رکھو موجوں میں اضطراب پیدا کرنے کے لئے طوفان بار بار نہیں آیا کرتے۔ دوسری بار تباہی ہوتی ہے مکمل تباہی۔ اگر اس وقت ہم کچھ نہ کر سکے تو جان لو کہ

گر یہی عالم تیرے طرز تغافل کا رہا
کوئی اک دن تجھ کو تجھ سے چرا لے جائیگا
مدعی رہ جائیں گے فریاد کرتے قتل پر
اور قاتل مسکراتا خوں بہا لے جائیگا

حضرات گرامی!

اپنی بے حرمتی پر آہ وزاری کرتا ہوا یہ مظلوم قبرستان ہمیں پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ آج تم ان قبروں پر فاتحہ پڑھنے آتے ہو۔ کل کو تم نے بھی یہیں خاک ہونا ہے۔ اگر آج ہم اس ظلم کو نہ روک سکے تو کل ہم آنے والی نسلوں کو کیا منہ دکھائیں گے۔ کیا آنے والی نسلیں ہمیں یہ طعنہ نہ دیں گی کہ تم ہمیں ایک قبرستان بھی نہ دے سکے۔ سوچو۔ غور کرو، ابھی وقت ہے کہیں ایسا نہ ہو، کہ کل کو ہم بھی اس قبرستان کے مکین ہو جائیں اور ہماری قبر پر کوئی دیا جلانے والا نہ ہو۔ اگر آج ہم نے اس قبرستان کے تقدس کو پامال ہونے دیا تو آنے والی نسلیں بھی ہماری قبروں کی بے حرمتی پر صرف تماشا دیکھیں گی۔ کیونکہ تاریخ اپنے آپ کو دھرائے گی۔ اسی لئے کہتا ہوں کہ

کرنا ہے تو کر دکچھ دنیا کے اس چمن میں
اس وقت کیا کرو گے جب لاش ہوئی کفن میں

اے اس آبادی کے نوجوانو، بزرگو، دوستو، ساتھیو!

آؤ ہم سب متحد ہو جائیں۔ اپنی مذہبی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کی قربانی کا عہد کریں۔ قبرستان، جو ہر آبادی کا بنیادی حق ہوتا ہے۔ اس حق کے لئے لڑیں، یہ وہ دور ہے جس میں حق کے لئے لڑا جاتا ہے۔ لیکن یہ لڑائی ہتھیاروں کی نہیں ہے۔ یہ لڑائی اقدار کی ہے۔ عزم، جذبہ، جرات ہمارے ہتھیار ہیں۔ ہم ان چیزوں سے لیس ہو کر میدان میں اتریں گے تو فتح ہماری ہے۔ آؤ ہم قبرستان کی حرمت تباہ کرنے والوں کے آگے سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن جائیں، فتح ہماری ہے۔ پھر حق ہمارا ہے۔ آؤ ہم آنے والی نسلوں کو ایک مثال دے جائیں کہ

کچھ بن نہ سکے گا تو ڈبو دیں گے سفینے
ساحل کی قسم منت طوفاں نہ کریں گے

ملا احمد جیون رحمۃ اللہ علیہ

کی شہرۂ آفاق تفسیر

تفسیرات احمدیہ

جس کا نہایت سلیس اور دلکش انداز میں اردو ترجمہ

جناب مفتی محمد شرف الدین اشرفی

خطیب اعظم ملٹن کینز، انگلینڈ نے کیا۔

ضیاء القرآن پبلی کیشنز

لاہور، کراچی -- پاکستان

اللہ کے شاہکار محمد
کرن کرن اجالا
ضیاء القرآن پبلی کیشنز
7221953-7220479
7238010
7225085-7247350
2630411-2212011
2210212